تذکرۂ
مولانا حافظ عبد الرؤف علیہ الرحمہ بلیاوی
نائب شیخ الحدیث
دار العلوم اشرفیہ مصباح العلوم مبارکپور
از
مولانا قمر الحسن بستوی مصباحی
المجمع الاسلامی
فیض العلوم ـ محمد آباد گوہنہ ۲۷۶۴۰۳ یوپی

محمد عبد الرحمن حبیبی مصباحی بھدوہی یوپی انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تذکرہ

مولانا حافظ عبدالرؤف علیہ الرحمہ بلیاوی

حافظ ملت کے ایک ممتاز شاگرد

دارالعلوم اشرفیہ مصباح العلوم کے سابق نائب شیخ الحدیث

تالیف

مولانا قمر الحسن بستوی مصباحی

اضافہ

مولانا محمد احمد مصباحی

استاذ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارکپور

(ناشر)

المجمع الاسلامی، فیض العلوم

محمد آباد گوہنہ ۲۷۶۴۰۳ (یوپی)

قیمت ۱۵/۰

سلسلۂ اشاعت ۲۲

- کتاب ـــــــ تذکرہ مولانا حافظ عبد الرؤف بلیاوی علیہ الرحمہ
- تالیف ـــــــ مولانا قمر الحسن بستوی مصباحی۔
- اضافہ ـــــــ مولانا محمد احمد مصباحی، نگراں المجمع الاسلامی
- کتابت ـــــــ ظفر الاسلام ادروی قادری
- تصحیح ـــــــ مولانا محمد عبد المبین نعمانی رکن المجمع الاسلامی
- اشاعت اول ـــــــ جنوری ۱۹۹۳ء / رجب ۱۴۱۳ھ
- مطبع ـــــــ
- تعداد اشاعت: ایک ہزار قیمت: -/۱۵ روپے۔ صفحات ۱۲۰
- ناشر ـــــــ المجمع الاسلامی، محمد آباد گوہنہ ۲۷۶۴۰۳

بہ تعاون

جناب عبد العلی عزیزی، عبد القوی عزیزی، عبد النبی عزیزی، صاحبان،

ٹیکسی مینس کالونی ــــ کرلا ــــ بمبئی ۷۰

ابنائے حضرت مولانا کاظم علی مصباحی (متوفیٰ ۱۴۱۲ھ / ۱۹۹۲ء)

ساکن موضع دیوریا لال، ضلع بستی (یو، پی)

سابق شیخ الحدیث دار العلوم تدریس الاسلام بسڈیلہ، ضلع بستی

حسب فرمائش: حضرت مولانا کاظم علی علیہ الرحمہ،

بتوسط: عزیز ملت حضرت مولینا شاہ عبد الحفیظ صاحب دام ظلہ، سربراہ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ مبارکپور

برائے ایصال ثواب: حافظ ملت حضرت علامہ شاہ عبد العزیز مرادآبادی قدس سرہ

کلمۃ المجمع

تاریخ و تذکرے کے ضمن میں بعض شخصیات کی انفرادی سوانح حیات کا سلسلہ کوئی نیا نہیں ہے۔ زمانۂ قدیم سے مؤرخین و مصنفین اپنے اپنے عہد کی عظیم شخصیات کے حالاتِ زندگی قلمبند کرتے رہے ہیں ـــــــ "تذکرۂ مولانا حافظ عبدالرؤف بلیاوی" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جسے فاضل نوجوان مولانا قمرالحسن قمر بستوی مصباحی (ایم اے) نے بڑی عرق ریزی اور تلاش و تفتیش کے بعد تحریر فرمایا ہے ـــــــ ماہر علوم و فنون، استاذالاساتذہ حضرت علامہ حافظ عبدالرؤف بلیاوی علیہ الرحمہ سابق نائب شیخ الحدیث دارالعلوم اشرفیہ مبارکپور، بلاشبہہ وارثِ علوم رسالت اور سچے نائب حافظ ملت تھے۔ آپ کی ذات گرامی کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ "آپ چودہویں صدی ہجری نصف آخر کے ہندوستان میں علوم و فنون کے کوہِ ہمالہ تھے" تو بالکل درست ہے۔ باصلاحیت علماء و اساتذہ کی ایک لمبی جماعت آپ کی درسگاہِ فیض سے استفادہ کرکے آج علم کی جوت جگائے ہوئے ہے ـــــــ دارالعلوم اشرفیہ مبارکپور کے وقار و عظمت اور اس کی ترقی میں آپ کی عرق ریزی و جانکاہی، حسن انتظام و تدبیر اور بے لوث خدمات کا بہت بڑا ہاتھ ہے ـــــــ آپ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بلکہ یوں کہا جائے کہ تمام سرمایہ دارالعلوم اشرفیہ کی نذر کر دیا تھا تو شاید غلط نہ ہوگا اور خود الجامعۃ الاشرفیہ کا تخیل بہت حد تک آپ ہی کی دین ہے۔ اس لئے ایسی عظیم ہستی کا تعارف اور سوانح حیات کو آئندہ نسلوں تک پہونچانا، اور علم و تعلیم کے میدان میں آپ کے بیش بہا نظریات و افکار سے قوم کو روشناس کرانا آپ کے تلامذہ اور متعلقین اشرفیہ پر ایک طرح کا قرض تھا جسے بہت پہلے ہی ہمیں اپنے سر سے اتار دینا چاہئے تھا۔ مگر "کُلُّ اَمْرٍ مَرْھُوْنٌ بِاَوْقَاتِہٖ" کے تحت اس خدمت گزاری کا

قرعۂ فال عزیز گرامی فاضل نوجوان مولانا قمر الحسن قمر بستوی مصباحی کے نام نکلا۔ اور انہوں نے ایک قلیل مدت میں حضرت کے سوانح حیات جامع انداز میں قلمبند کر کے ہم سب کا قرض چکا دیا ——— مولیٰ تعالیٰ مؤلف موصوف کو علمی ترقیات اور طول حیات وبرکات سے نوازے آمین ——— بجاہِ حبیبٖ سیدِ المرسلین علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والتسلیم۔

ہمارے ممدوح، جامع العلوم حضرت علامہ حافظ عبد الرؤف بلیاوی علیہ الرحمۃ والرضوان کی یہ کوئی مفصل سوانح حیات نہیں البتہ مختصر ہوتے ہوئے جامع ضرور ہے۔ ابھی آپ کی بساط علم وحیات کے بہت سے گوشے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں یا تلامذہ ومتعلقین کے اذہان میں پوشیدہ، اگر تمام معلومات جمع کر دی جائیں تو بلا شبہ ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے یہ کتاب مہمیز کا کام کرے۔ اور جو حضرات اس سلسلے کی مفید معلومات اپنے سینوں میں پوشیدہ رکھتے ہیں وہ انہیں منظر عام پر لانے کی کوشش کریں۔

محب مکرم فاضلِ جلیل حضرت مولانا محمد احمد مصباحی ایم۔ اے استاذ الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور نے بطور ضمیمہ "حافظ عبد الرؤف علیہ الرحمہ اور سُنّی دار الاشاعت" کے عنوان سے جن مفید معلومات کو یکجا کر دیا ہے وہ آپ کی حیات وخدمات کا ایک اہم باب ہے جسے کتاب میں شامل نہ کیا جاتا تو یقیناً بہت بڑی کمی رہ جاتی۔

یہ تذکرۂ جمیل جہاں حضرت علامہ حافظ عبد الرؤف بلیاوی علیہ الرحمۃ والرضوان کے تلامذہ کے لئے سرمایۂ عقیدت ہے وہیں دیگر علماء وطلبہ اہل مدارس اور متعلقین کے لئے ایک سبق آموز تاریخی کتاب بھی ہے۔ اس لئے امید ہے کہ اس کی اشاعت میں دلچسپی لی جائے گی تاکہ مؤلف وناشر کا مقصد بھی پورا ہو اور ایک قابلِ تقلید، عالم کامل کی تاریخ صفحاتِ قرطاس پر محفوظ بھی ہو جائے ———

یکے از تلامذہ

محمد عبد المبین نعمانی قادری، دار العلوم قادریہ چریا کوٹ مئو ۲۹/۶/۷۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں اپنی اس اوّلین قلمی کاوش کو موضع کیتھولیا ضلع بستی میں آرام فرمانے والے مرجع خلائق مردِ حق آگاہ درویش کامل جدِّ اعلیٰ حضرت ضیاء اللہ معروف بہ "ہمت بابا" علیہ الرحمۃ والرضوان کے نام نامی سے مُعنون کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں ـــــ جن کی دعائے شبینہ نے میرے شعور کی قندیل روشن کی اور پل پل فکر و آگہی کا اجالا بخشا ہے

وہ انفس و آفاق کا تابندہ ستارہ
روشن ہے اسی سے مرے افکار کی دنیا (قمر)

اک گدائے بینوا
قمر بستوی
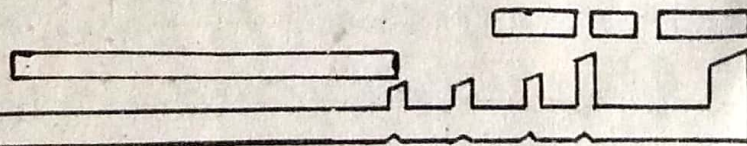
پیش لفظ

شعبان ۱۳۸۹ھ مطابق ۱۹۶۹ء کے عشرۂ اولیٰ کی ایک صبح کو دار العلوم اہلسنت تدریس الاسلام بسڈیلہ ضلع بستی میں انتہائی صفائی کا انتظام کیا گیا۔ کیا تھا کہ سالانہ امتحان میں امسال حضور حافظ ملّت تشریف نہیں لائیں گے۔ بلکہ دار العلوم اشرفیہ مصباح العلوم مبارکپور کے نائب شیخ الحدیث غزالی دوراں حضرت علامہ حافظ عبد الرؤف صاحب معروف بہ "حافظ جی" تشریف لانے والے ہیں ——— ایک عظیم اور عبقری شخصیت کا ورود کوئی معمولی بات نہیں تھی، خوشیوں کی لہر پورے ماحول میں محسوس ہو رہی تھی۔ اَن دیکھی آنکھوں میں ایک بہت ہی عظیم اور تو ری الجثہ شخصیت کا تصور گردش کر رہا تھا ——— کیوں نہ ہو، علم کا جبل شامخ آرہا ہے۔ انتظار کی گھڑیاں گزریں، آنے والا آیا، علماء اور طلبہ نے اس کا استقبال میل بھر کی دوری سے جا کر کیا ——— مگر جب آنے والا آیا تو تصورات کے سارے تراشیدہ فرضی پیکر یک لخت باطل ہو گئے ——— ایک دُبلا پتلا، نحیف و نزار، خفیف البدن دھان پان ——— اور تواضع کا مجسمہ بڑی تیزی سے دار العلوم کی طرف پیدل قدم قدم بڑھتا چلا جا رہا تھا ——— لاہوتی نعرے بلند ہوئے۔ غزالی دوراں زندہ باد، حافظ جی قبلہ زندہ باد ——— اور مختصر تن و توش اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ رونق دہ انجمن ہوا ——— امتحانات ہوئے، پھر آنے والا چلا بھی گیا۔

حضرت علامہ شاہ حافظ عبد الرؤف صاحب قبلہ علیہ الرحمۃ والرضوان کا میں نے عہد طفلی میں فقط دیدار کیا تھا۔ اس لئے ان خوش نصیبوں میں مَیں بھی شامل ہوں جنہوں

نے ایک قدآور اور آفاقی شخصیت کے جلوؤں سے اپنی انجمن دل روشن کی ہو تاہم غیر شعوری طور پر صرف شخصیت کا مرعوبی تصور رہی تھا ورنہ حصول کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ اگرچہ حضرت نے دارالعلوم میں صرف چند گھنٹوں میں سالوں کی پہنائیاں سمیٹ دی تھیں۔ آگے چل کر بالتدریج شعور کی بالیدگی نے ان کا عقیدت کیش بنا دیا اور میں دل کے نہاں خانے میں ان کی شخصیت اور خدمات پر دھندلی تحریریں لکھتا اور محو کردیتا۔ اسی اثنا میں بعد فراغت حضرت استاذ گرامی علامہ مفتی شبیر حسن صاحب قبلہ نے ۱۹۸۲ء میں عرس عزیزی کے موقع پر ایک مضمون حضرت موصوف کی شخصیت سے متعلق لکھنے کا حکم دیا۔ اور کچھ گوشے اجاگر بھی فرمائے۔ میں نے چند صفحات کا ایک مضمون ترتیب دے کر استاذ گرامی کی خدمت میں پیش کردیا۔ مگر وہ مضمون ماہنامہ اشرفیہ تک پہونچنے کے بجائے کاغذوں کی بھیڑ میں دب کر نسیاً منسیا ہوگیا۔ اور احساس کی ایک رمق جو باقی تھی وہ بھی منقطع ہوگئی ——

مگر پھر جب علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں برائے حصول تعلیم حاضر ہوا تو کرم فرما جناب ڈاکٹر سید محی الدین اظہر مرحوم سابق لکچرار شعبۂ فارسی نے دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دی۔ چونکہ موصوف حضرت حافظ جی سے بیحد متاثر تھے۔ اس کے بعد ذہن پھر اسی نہج پر سوچ رہا تھا۔ لیکن کچھ کر نہ سکا۔

وقت تیزی سے گذرتا گیا۔ مغربی بنگال کی مرکزی درسگاہ دارالعلوم ضیاء الاسلام ہوڑہ حاضر ہوا تو احساسات پھر بیدار ہوئے۔ اِدھر تائید غیبی پس پردہ اسباب فراہم کرچکی تھی۔ چونکہ حضرت موصوف علیہ الرحمہ کی ابتدائی زندگی ہوڑہ ہی سے متعلق ہے اور ان کے برادر امجد حضرت مولانا محمد امین الدین صاحب بلیاوی علیہ الرحمہ (متوفی ۳۰؍مارچ ۱۹۸۷ء) بھی یہیں قیام پذیر تھے۔ متعلقین کا رہن سہن یہیں ہے —— اس حیثیت سے ایک اچھا خاصہ ماخذ مل گیا۔ پھر کیا تھا تذکرہ کا کام شروع کر دیا۔

اور فارغین اشرفیہ نیز تلامذہ حضرتِ موصوف سے مراسلت بھی کی گئی ۔ اعلانات شائع کرائے ۔ مگر ناکامیوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا ۔ کچھ لوگوں کے جواب ملے جس میں صرف "ایک اچھا کام ہے" کا اظہار خیال تھا اور بس ، اور کچھ لوگوں کے خطوط آئے جس میں عموماً گھوم پھر کر ایک ہی بات ہوتی ۔ اس طرح جتنے بھی خطوط ملے ان کے مضامین ایک ہی محور پر گردش کرتے رہے ۔ اسی امید و بیم میں تھا کہ سرکار مدینہ کانفرنس میں رئیس التحریر حضرت علامہ ارشد القادری اور استاذ گرامی حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ سے ملاقات ہوئی ۔ حضرت بحر العلوم نے کرم فرمایا ۔ اور رئیس التحریر نے بھی سفر و حضر میں میری ہمت بندھائی ۔ اس طرح یہ تذکرہ وجود میں آیا ۔

اس کے مآخذ کے متعلق واضح کر دینا چاہوں گا کہ کچھ اقوال راویوں سے بالمشافہہ سُنکر نقل کئے گئے ہیں ۔ جس سے قول سماعت کیا گیا ہے اس کا نام درج کر دیا گیا ہے ۔ اور کچھ خطوط کے ذریعہ معلومات حاصل کی گئی ہیں ۔ جن کی نشاندہی کر دی گئی ہے اور کچھ رسالوں سے مدد لی گئی ہے ۔ ان کے حوالے بھی درج کر دیئے گئے ہیں ۔ کچھ اقوال ایسے بھی ہیں جن کے راوی کا پتہ نہیں تو ان کو ویسے ہی نقل کر دیا گیا ہے ۔ تاہم احتیاط کی گئی ہے کہ کوئی ایسا واقعہ نہ نقل ہو جو عقلاً اور نقلاً ناقابل قبول ہو ۔

اس کو بہت پہلے منظر عام پر آجانا چاہیے تھا ، مگر ایک تو کثرتِ مشاغل تدریس ، تقریر ، اور تحریر نے فرصت کم دی ۔ دوسرے مآخذ کی فراہمی میں وقت گذرتا گیا ۔ اس کے باوجود یہ مختصر ہے ۔ میری خواہش تھی کہ اس کو ایک تفصیلی تذکرہ کے نہج پر پیش کروں مگر ارباب کرم کی بے اعتنائیوں نے مجبور کر دیا اور اسی پر بس کرنا پڑا —— یہ تذکرہ حضرت موصوف کی حیات و خدمات کے سلسلے میں انتہا نہیں تصور کرنا چاہیئے بلکہ ابتدا ہے ۔ ارباب نظر اس کو طول دے سکتے ہیں —— میں ان تمام

حضرات کا جن لوگوں نے اس تذکرہ میں میری رہنمائی کی تہِ دل سے شکرگذار ہوں۔
خصوصاً حضرت مولانا محمد امین الدین صاحب حامدی علیہ الرحمہ، اور رئیس التحریر حضرت
علامہ ارشد القادری صاحب، اور بحرالعلوم حضرت استاذ گرامی علامہ مفتی عبدالمنان
صاحب کا کہ اگر ان بزرگوں کا حرفِ تسلی میسر نہ ہوتا تو میں ہمت ہار چکا تھا ــــــ
اور اگر برادر مخلص حضرت مولانا شمس الہدیٰ صاحب استاذ الجامعۃ الاشرفیہ کا
شکریہ نہ ادا کروں تو شکایت ہوگی۔ کیونکہ انہوں نے اشرفیہ سے متعلق ہر طرح
کی معلومات فراہم فرمائیں۔ اس طرح یہ تذکرہ تنکا تنکا جمع کر کے آشیانہ بن گیا ؎

خاک میخانہ سفال جام کچی ٹھکریاں
بکھرے ذروں کو جمع کر کے سلیماں ہو گیا (قمر)

اخیر میں ان جملوں پر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ کاش یہ نذرانۂ خلوص حضرت
موصوف کی بارگاہ میں قبول ہو جاتا تو میں اپنی کوششوں کی کامیابی کی معراج تصوّر کرتا۔
المجمع الاسلامی مبارکپور کے بانیان وارکان بالخصوص حضرت مولانا محمد احمد مصباحی
بھیروی، استاذ الجامعۃ الاشرفیہ اور مولانا محمد عبدالمبین نعمانی قادری مدیر ماہنامہ اشرفیہ
کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں، کہ انہیں حضرات کے حوصلہ افزا اقدام اور
توجہ سے یہ قلمی کاوش منصۂ شہود پر آرہی ہے ــــــ بحمدہٖ تعالےٰ المجمع الاسلامی
کے بانیان حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کے ہی خرمنِ علم کے خوشہ چیں ہیں۔ اِس طرح
گویا یہ ادارہ بھی حضرت علیہ الرحمہ ہی کی اشاعتی فکر کا ایک پیکر محسوس ہے۔ جس کی
چند سالہ کوششوں سے قلمی میدان میں جو ستھرا انقلاب برپا ہوا ہے۔ وہ اہلِ علم پر عیاں
ہے ــــــ خدائے قدیر اسکو حاسدین کے شر سے محفوظ رکھے، اور روز افزوں
ترقی سے نوازے، اور اہل علم و ثروت حضرات کو اس کے مخلصانہ تعاون کی توفیق
بخشے ــــــ (آمین)

(قمر الحسن قمر بستوی)

منقبت

درشان مظہر اعلیحضرت، دعائے تاجدار اہلسنت، نائب حضور
حافظ ملت، غزالی دوراں حجۃ العصر جامع العلوم علامہ شاہ
حافظ عبدالرؤف صاحب قبلہ قدس سرہٗ نائب شیخ الحدیث
دارالعلوم اشرفیہ مصباح العلوم مبارکپور۔ اعظم گڈھ

زہد و تقویٰ کے امیں اخلاص کے کوہِ گراں
ایک علم و فضل کے موّاج بحرِ بیکراں

تیری پیشانی میں روشن حکمتوں کے ماہتاب
تیری ہر ہر بات سے افکار کے موتی فشاں

تو امام اعظم دین متیں کا نقش گیر
حضرت رازی، غزالی کی نظر کا رازداں

ایک حضرت اشعری و ماتریدی کا مزاج
تیری نکتہ سنجیوں سے اللہ اللہ ہے عیاں

وہ امام اہلسنت حضرت احمد رضا
اس کا مظہر ذات تیری تو اسی کا اک نشاں

حافظ ملت کا بازو مفتیٔ اعظم کا چین
حضرت صدر الشریعہ کے چمن کا پاسباں

تیرا دل آماجگاہ عشق ختم المرسلیں
شرع کے جامہ میں کوئی جیسے منصورِ زماں

حجۃ فارابی و سینا پہ تیرا حرفِ حق
دعویٔ حقانیت کا ہے کوئی کوہِ گراں

ہیئت و توقیت و منطق، ہندسہ علم جفر
اور نجوم و فلسفہ لوگارثم سائنس داں

ہیں ترے فتراک میں نخچیر ہائے فلسفہ
اور کمان علم میں قرآن کے تیر و سناں

تیرے علم و فضل کے ہر سمت مہکاتے ہیں پھول
ہند کے ہر خطۂ ارضی پہ تیرا گلستاں

تربت خاکی میں ہے فانوس علم مصطفےٰ
ذرہ ذرہ لمعۂ افکار کی ہے کہکشاں

تو ہے آفاقی ترا ہر ہر قدم آفاقیت،
پھر قمر کچھ کہہ سکے تاب سخن اسکو کہاں

نتیجۂ فکر: —— مولانا قمر الحسن، قمر بستوی

سراپا

قد متوسط ــــ بدن، دبلا پتلا چھریرا ــــ رنگت گندم گوں ــــ چہرہ، کتابی ــــ سر، میانہ گول ــــ بال، نرم نرم مختصر ــــ پیشانی کشادہ، جس پر فکر و آگہی کی لکیریں، قدرے ابھری ہوئی ــــ ابرو، دونوں الگ الگ متوسط نہ ہلکے نہ گھنے، جس سے مفکرانہ شان نمایاں ــــ آنکھیں روشن، درمیانہ بصارت و تدبر سے لبریز، قدرے اندر کو دبی ہوئی ــــ پلکیں گھنی سیاہ جن سے حیا و شعور کا ترشح ــــ ناک، ستواں پروقار ــــ رخسار، معتدل گوشت مختصر ــــ لب، پتلے سرخی مائل جو ہمیشہ علم و حکمت کے موتی لٹاتے ــــ دہن، کشادہ جس میں زبان علوم کا گنجینہ ــــ دندان، معتدل، فراخ، بہ وقت تبسم نظر آتے ــــ ریش، مختصر، متفرق زیادہ گھنی نہیں ــــ مونچھ، پست، نہ چوڑی نہ باریک، دونوں کنارے داڑھی سے متصل ــــ ٹھوڑی گول ــــ گردن، صراحی دار لمبی قدرے سیدھی ــــ شانے، ہموار ــــ ہاتھ، لمبے بازو، ہلکے گوشت سے قدرے خالی، مگر مضبوط ــــ ہتھیلیاں، فراخ، سخت اور ہلکی ــــ انگلیاں، لمبی پتلی ــــ گھائیاں، کشادہ ــــ ناخن، سفید مائل بہ سرخی سینہ، کشادہ علم و حکمت کا گنجینہ ــــ شکم، سپاٹ، سینہ کے مقابل کچھ دبا سا، پشت، ہموار ــــ کمر، پتلی، متناسب خدمتِ دین کیلئے کمربستہ ــــ پنڈلیاں، ہلکی قدرے سخت، پاؤں، لمبے ــــ ایڑیاں، قدرے مستطیل غیر مدوّر جو چلنے میں پروقار نظر آئیں، پنجے، انگلیاں ملی ہوئی ــــ **وضع قطع** ــــ کرتا، لمبا کلی دار گھٹنے تک پاجامہ چوڑی موری کا ٹخنوں سے قدرے اوپر، ٹوپی، دوپلی کبھی سادہ، رومال، سادہ لمبا مائل بہ زردی، شیروانی، لمبی ڈھیلی، بنڈی درزی کی سلی ہوئی اوری، اندر جیب، جوتا، پمپ گہرا براؤن، لنگی، مدراسی۔ (بشکریہ، مولانا منار المصطفےٰ صاحب امجدی)

نام ونسب

نام ــــــــــــــ عبدالرؤف

والد ماجد ــــــــــــــ محمد اسلام

جدّامجد ــــــــــــــ بخش اللہ

برادران ① مولانا امین الدین صاحب ② عبدالکریم صاحب

مولانا عبدالرؤف صاحب معروف بہ حافظ جی علیہ الرحمہ سب سے چھوٹے تھے عبدالکریم صاحب نے ایامِ شباب ہی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مگر برادر امجد حضرت مولانا امین الدین صاحب ابھی ۲۹ رجب ۱۴۰۷ھ مطابق ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ موصوف انتہائی متقی و پرہیزگار تھے۔

والدہ ماجدہ ــــــــــــ آسیہ خاتون ــــ یہ انتہائی نیک سیرت اور پرہیزگار خاتون تھیں۔

اولاد: صاحبزادگان ــــ ① شبیر احمد صاحب (ایم اے ٹرپل) ② محمد مختار صاحب ــــ ③ محمد جمیل صاحب، ــــ

صاحبزادیاں ــــــــ جو بڑی تھیں، مولانا رحیم اللہ صاحب سے اور دوسری مولانا ضیاء المصطفےٰ صاحب سے اور تیسری مبارکپور (ارجنٹی) کے مختار احمد صاحب سے منسوب تھیں۔

مولد وموطن

صوبۂ اتر پردیش کے ضلع بلیا (جو مشرقی یوپی میں واقع ہے) کی تحصیل بانس ڈیہہ میں ایک قریہ بھوجپور ہے۔ اسی میں ۱۹۱۲ء میں[۱] پیدا ہوئے۔ یہی آپ کا آبائی وطن ہے۔ آپ کی کئی پشتیں یہیں زندگی بسر کر چکی ہیں، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس سے قبل آپ کے اجداد کہاں کے باشندے تھے۔ اور

---

[۱] اشرفیہ حافظ ملت نمبر ص ۱۲۰،۲۸

بلیا ضلع کے اس دیہات میں کس سنہ میں تشریف لائے۔ البتہ یہ مسلم ہے کہ اجداد سے کئی پشتیں یہیں قیام پذیر ہیں۔ مگر صاحبِ تذکرہ علمائے اہلسنت جناب مولانا محمود احمد قادری نے آپ کا وطن رسڑا ضلع بلیا تحریر فرمایا ہے۔ جبکہ حضرت موصوف کے برادر کلاں حضرت مولانا امین الدین صاحب سے تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ آپ کا مولد و موطن موضع بھوجپور، ڈاکخانہ گردار تحصیل بانسڈیہہ ضلع بلیا ہے ممکن ہے صاحب تذکرہ علمائے اہلسنت نے آپ کا مولد رسڑا اس لئے تحریر فرمایا ہو کہ وہ بھوجپور کے قریب ایک مشہور و معروف ترقی یافتہ قصبہ ہے۔ اس کی شہرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کی جائے پیدائش رسڑا تحریر فرمادیا ہو ——— یہی قرین قیاس ہے۔

بوقتِ پیدائش والد ماجد محمد اسلام صاحب ہوڑہ میں تھے۔ ریلوے سروس تھی اس لئے زیادہ اوقات ہوڑہ ہی گذرتے تھے۔ پیدائش کے مبارک موقعہ پر حسبِ روایت خوشیاں منائی گئیں۔ عہد طفلی گذار کر جب چلنے پھرنے کے لائق ہوئے تو والد صاحب کی مجبوریوں کے پیش نظر والدہ ماجدہ کے ساتھ وطنِ مالوف سے ہوڑہ (مغربی بنگال) چلے آئے۔

پنجم تلہ ہوڑہ میں والد ماجد ایک کوارٹر میں رہائش پذیر تھے۔ والدین کی شفیق نگاہوں کے سائے تلے آپ مغربی بنگال کی فضاؤں میں اپنی طفلانہ زندگی کے شب و روز گذارتے رہے۔ جب کچھ شعور بالیدہ ہوا اور زبان کی سستگی ظاہر ہوئی تو دیندار گھرانے میں پاکیزہ ماحول رکھنے والے والدین نے اپنے بچے کو علم کے پہلے زینہ پر کھڑا کرنا چاہا ——— چونکہ یہ قدیم کہاوت ہے کہ "جیسا ماحول ہوتا ہے اولاد پر ویسا ہی اثر پڑتا ہے"۔ والدین سادہ زندگی گذارنے کے خوگر تھے اور صوم و صلوٰۃ کے پابند، گھرانہ دینی تھا۔ گو کہ والد صاحب سرکاری ریلوے سروس سے متعلق تھے مگر مزاج میں مذہبیت پوری طرح اثر انداز تھی۔ اس لئے اپنے دیگر

بچوں کی طرح اس بچے کو بھی اسلامی روش پر لگا دیا ـــــــــ اور رسم بسملہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

رسم بسملہ شریف

رسم بسم اللہ شریف پنجم تلہ ہوڑہ ہی میں ادا کی گئی۔ ابھی کم عمری تھی کہ یہ رسم انجام پذیر ہوئی۔ حافظ دین محمد صاحب نے اس مقدس کام کو انجام دیا۔ پھر سبقاً سبقاً بڑے بھائی مولانا امین الدین صاحب سے پڑھتے رہے ـــــــــ تعلیمی سلسلہ جاری ہو گیا مگر قدرت کی کرم فرمائی کا یہ منظر اپنی مثال آپ ہو گیا۔ کس کو پتہ تھا کہ پنجم تلہ ہوڑہ میں ادا کی جانے والی یہ رسم بسملہ ایک طفل نوخیز کی شکل میں ایک مفکر کے نقطۂ عروج کے آغاز کی رسم ادا کی جا رہی ہے۔ عہد طفلی کا مزاج ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ جب تک بچوں پر سختیاں نہ کی جائیں اس وقت تک وہ تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ بلکہ بسا اوقات تو ایسا دیکھا گیا ہے کہ بعض ہونہار اور ذہین بچے بھی اپنی اس ابتدائی منزل کو عبور کرنے میں زمانہ لگا دیتے ہیں اور کامیابی سے پھر بھی ہمکنار نہیں ہو پاتے۔ مگر یہاں تو حال ہی کچھ اور تھا۔ استاذ شاگرد کا معاملہ الگ تھلگ، استاذ پڑھانے سے حیران مگر شاگرد کی سیرابی نہیں ہو پاتی۔

عہد طفلی میں ذہانت کا ایک حیرت انگیز واقعہ

حضرت مولانا امین الدین صاحب بیان فرماتے ہیں کہ حافظ جی قاعدہ بغدادی کی حروف تہجی پڑھ رہے تھے اور میں ان کو پڑھا رہا تھا۔ جب ق پر پہونچے تو میں نے کہا کہ بڑا قاف اور پھر ک پر پہونچے تو کہا کہ چھوٹا کاف اس پر انہوں نے مجھ سے اعتراض کیا کہ یہ ک اتنا لمبا ہے چھوٹا کاف کیسے ہو جائے گا اس کو بڑا قاف ہونا چاہئے۔ اور وہ ق اس سے چھوٹا ہے اس لئے اس کو چھوٹا ہونا چاہئے ـــــــــ میں یہ سوال سنکر حیرت میں پڑ گیا کہ یہ عمر اور ایسا سوال؟ میں نے اپنا دامن چھڑانے کے لئے سمجھایا کہ دیکھتے نہیں

ہو، اس کے اوپر دو ٹوپی لگی ہوئی ہے۔ اس لئے یہ بڑا قاف ہے۔ اور اس کے اوپر ٹوپی نہیں ہے اس لئے یہ چھوٹا کاف ہے ——— مگر ان کو اس سے تشفی نہیں ہوئی۔

قوتِ حافظہ اور جودتِ طبع قوت حافظہ اور جودت طبع کا یہ حال تھا کہ ایک ایک روز میں کئی کئی سبق سناتے اور اتنی صحت کے ساتھ کہ استاذ بھی عش عش کر اٹھتے۔ یا اللہ یہ طفل نوخیز آیا انسان ہے یا کسی اور مخلوق سے تعلق رکھتا ہے۔ حافظہ اتنا عمدہ اور قوی تھا کہ جو ایک مرتبہ پڑھ لیتے ذہن میں مستحضر ہو جاتا ——— چند ہی روز میں قاعدہ ختم کر کے عم پارہ شروع کیا۔ مولانا امین الدین صاحب فرماتے ہیں کہ

"ایک تو خداوند قدوس نے قوتِ حافظہ کی بے پناہ دولت سے نوازا تھا دوسرے ذوقِ علم کا عجیب حال تھا کہ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے پڑھا کرتے"۔

ایک مرتبہ محنت اور دل جمعی دیکھ کر والد ماجد نے فرمایا کہ

"عبدالرؤف بڑا ذہین معلوم ہوتا ہے، جب دیکھو پڑھتا ہی رہتا ہے"۔

یہی وجہ تھی کہ جب عم پارہ کی چند ابتدائی سورتیں پڑھیں تو اس کو زبانی یاد کر لیا اور بہت ہی انہماک کے ساتھ پڑھتے رہے۔ بچپن میں بھی ایسی حرکتیں کم کرتے جس سے کسی کو تکلیف یا خرافات کی جھلک ملتی۔ جب سے پڑھنا شروع کیا اسی وقت سے علمی کشش میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور بہت تھوڑی مدت میں عم پارہ بھی ختم فرما لیا۔ صحت حروف اور پڑھنے کا انداز بہت ہی نرالا تھا۔ چونکہ استاذ نے بھرپور لگن سے پڑھایا تھا اس لئے روز بروز نکھار ہوتا ہی گیا۔ جب ابتدائی تعلیم کی تکمیل ہوگئی تو والد ماجد نے حفظ قرآن مقدس کے لئے بٹھا دیا۔

حفظ قرآن پاک: چونکہ والد ماجد ہوڑہ ہی میں رہتے تھے۔ اس لئے حافظ جی

علیہ الرحمہ کو اتنی چھوٹی عمر میں کہیں باہر بھیجنا مناسب نہ خیال کرکے یہیں پر حفظ شروع کرا دیا۔ ماموں جان حافظ دین محمد صاحب بھی ہوڑہ ہی میں رہتے تھے۔ اس لئے انہیں سے بہشتی پاڑہ (ہوڑہ) میں درس لیا کرتے تھے۔ اور نانی ہال بھی یہیں تھا اس لئے بلفظ دیگر اپنے ننیہال میں حفظ قرآن مقدس کی تعلیم پائی۔ بے پناہ قوت حافظہ ہونے کی وجہ سے بہت ہی جلد حفظ مکمل فرمالیا، قرآن مقدس بہت عمدہ یاد کیا۔ جس سال حفظ ختم فرمایا۔ اسی سال مولانا شمس الحق صاحب کی مسجد چنگیل (ہوڑہ) میں تراویح پڑھایا۔ ابھرتی ہوئی عمر جوانی کا دوآتشہ قرآن مجید کی مسحورانہ کیفیت اور روانی نے لوگوں کے دلوں کو جیت لیا، اور آپ کی بہت پذیرائی ہوئی۔ مولانا امین الدین صاحب فرماتے ہیں کہ

"حضرت مولانا شمس الحق صاحب (نسبت پوری) بلیاوی اپنے ساتھ چنگیل (ہوڑہ) لے جاتے تھے تو ایک ایک رمضان المبارک میں تین تین محراب قرآن مقدس سناتے تھے۔ اور تکان یا کسی پریشانی کا کبھی بھی اظہار نہیں کیا نہ آپ کے چہرہ بشرہ سے کوئی اثر نمایاں ہوتا۔"

ابتدائی عربی و فارسی ذہن سلیم کی جولانیت آشکارا ہو چکی تھی۔ عمر کے ابتدائی حصہ میں حفظ قرآن مقدس کی نعمت سے بہرہ مند ہونے کے بعد درس نظامیہ کی ابتدائی کتابیں یعنی فارسی وغیرہ شروع کرا دی گئیں اس کے لئے اپنے بڑے بھائی مولانا امین الدین صاحب کے سامنے نیازمندی حاصل کی۔ اور فارسی کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ گلستاں، بوستاں، یوسف زلیخا، سکندر نامہ وغیرہ کتابیں برادر امجد سے پڑھیں۔ اور پھر ابتدائی عربی کیلئے حضرت مولانا شمس الحق بلیاوی سے رجوع کیا۔ پنچم تلہ ہوڑہ میں میزان الصرف اور منشعب ختم کیا۔ اور اس کے بعد مسافرت کا دوسرا دور شروع ہوا۔

امروہہ میں ورود و قیام: چونکہ علم دین حاصل کرنے کے لئے جیسا کہ اسلاف

سے چلا آیا ہے کہ گھر بار چھوڑ کر باہر ہی علم دین کی تکمیل کرتے رہے۔ اسی روش پر حضرت موصوف بھی گامزن ہوئے۔ اور اب مسافرت کی دوسری منزل میں قدم رکھنے کے انتظامات کئے جارہے ہیں۔ عہد مادریں تھے تو وطن چھوڑ کر ہوڑہ آئے تھے۔ اب ماں کی ممتا اور باپ کی شفقتوں کو چھوڑ کر کوسوں دور کا رخت سفر باندھا، اور ۱۳۵۱ھ ذی قعدہ کے مہینہ میں کلکتہ سے تنہا امروہہ تشریف لے گئے۔ غالباً اس وقت امروہہ علم وفضل کے اعتبار سے شہرت یاب ہو چکا تھا۔ اس لئے تشنگان علم دین اسی میکدہ کا رخ کر رہے تھے ——— بحوالہ بحر العلوم حضرت مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کے ایک ہم درس حضرت مولانا اختر حسن صاحب ادر دی فرماتے ہیں کہ

مولانا عبدالرؤف صاحب امروہہ ضلع مراد آباد کے مدرسہ حنفیہ محلہ گذری میں ۱۳۵۱ھ سے ۱۳۵۳ھ تک تین سال رہے۔ ۱۳۵۱ھ میں کلکتہ سے اکیلے شوال کے بجائے ذوالقعدہ میں وہاں پہونچے تھے۔ امروہہ میں آپ کی تعلیم کی ابتداء ہدایۃ النحو، علم الصیغہ، قدوری، مرقاۃ، وغیرہ سے ہوئی۔ اور تین سال میں شرح جامی بحث اسم تک وہیں پڑھا۔ اس وقت وہاں شعبۂ عربی میں تین مدرس تھے۔ حضرت مولانا سید محمد خلیل صاحب کاظمی امروہوی صدر المدرسین، مولوی حکمت اللہ صاحب امروہوی مدرس دوم، مولانا غلام جیلانی صاحب گھوسوی اعظمی مدرس سوم مولانا عبدالرؤف صاحب نے بیشتر کتابیں مولانا غلام جیلانی صاحب سے پڑھیں منطق کی کتابیں، مولوی حکمت اللہ صاحب سے، اور فقہ کی کتابیں مولانا سید محمد خلیل صاحب کاظمی سے، درس میں مولانا عبدالرؤف صاحب لڑتے اور بحث نہیں کرتے تھے۔ لیکن بالکل گم سم بھی نہیں رہتے تھے کبھی کبھی استاذ سے پوچھ بھی لیا کرتے تھے۔ ابتدائی کتابوں میں چونکہ زیادہ ضرورت یاد کرنے کی ہوتی ہے اور مولانا عبدالرؤف صاحب حافظ تھے۔ اس لئے بڑی محنت کرتے اور اسباق

خوب رٹ کر یاد کرلیا کرتے۔ بڑے طلبہ کے قیام وطعام کا انتظام امروہہ میں مساجد میں ہوتا تھا۔ طالب علم مسجد کے حجرہ میں رہتا پنج وقتہ امامت کرتا۔ اور اہل محلہ اس کے کھانے کے کفیل ہوتے۔ کبھی ایک ہی آدمی کے گھر سے کھانا آتا۔ اور کبھی کئی کئی لوگوں کے یہاں سے، مولانا عبدالرؤف صاحب پہلے سال محلہ جھنڈ شہید کی مسجد میں رہے اور دوسرے سال محلہ سرائے کی مسجد میں رہے"۔

چونکہ موصوف نے حفظ بھی کیا تھا۔ اس لئے عمر کا ایک خاص حصہ گذار کر علوم عربیہ کی طرف توجہ فرمائی۔ یہ اس وقت کوئی معیوب بات نہیں تھی۔ بلکہ عموماً لوگ پختہ عمر ہو جانے کے بعد ہی مدارس میں داخل ہوتے تھے۔ اسی لئے عمر کا ایک اچھا حصہ حصول علم میں ختم ہو جاتا تھا۔ یہی حال حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کا تھا۔ کہ وہ اپنی عمر کی بیس فصل بہار گذار دینے کے بعد امروہہ کی سرزمین پر علم کی تشنگی بجھانے گئے تھے۔ بقول مولانا اختر حسن صاحب کہ

"مولانا عبدالرؤف صاحب جب امروہہ پہونچے تو غالباً بیس سال کے رہے ہوں گے۔ ہلکی ہلکی داڑھی تھی۔ اندازہ یہ ہے کہ اس وقت وہ شادی شدہ تھے۔ لیکن عام نوجوانوں کی طرح کبھی بیوی کا ذکرہ نہیں کیا بلکہ اگر کسی نے اس موضوع پر گفتگو کی کہ آپ کی شادی ہوئی یا نہیں؟ تو آپ کو سخت ناگوار ہوتا۔ امروہہ کے دوران قیام کبھی آپ نے لڑائی جھگڑا نہیں کیا، نہ ہی کسی خاص چیز سے شوق اور رغبت ظاہر کی۔ جب تک امروہہ رہے ہم سب لوگ سال میں صرف ایک بار گھر آتے اور شوال میں ساتھ ہی مدرسے پہونچتے۔ اور شعبان میں ساتھ ہی واپسی ہوتی۔ امروہہ سے چل کر دو، تین یوم بریلی شریف قیام کرتے پھر وہاں سے بذریعہ کنسیشن ٹکٹ اوری آتے دو ایک دن قیام کر کے پھر گھر بلیا جاتے۔ وہاں (امروہہ) کے امتحانات میں ہمیشہ

اچھے نمبروں سے پاس ہوتے"۔

امروہہ میں تین سال کا عرصہ گذار کر احسن المدارس قدیم نئی سڑک کانپور میں تشریف لائے مگر یہاں کوئی زیادہ دن قیام نہ کر سکے۔ کیونکہ اس وقت افق علم پر اشرفیہ کا مہر درخشاں ضو پاشی کر رہا تھا۔ اس لئے مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارکپور ضلع اعظم گڑھ میں تشریف لائے۔ جیسا کہ معلوم ہوا ہے کہ اجمیر معلّی دار العلوم معینیہ میں بھی تعلیم حاصل کی مگر وہاں کا سنہ تعلیم اور جانا صحیح تاریخوں سے فراہم نہ ہو سکا۔ قیاس ہے کہ امروہہ سے اجمیر معلّی تشریف لے گئے ہوں، پھر وہاں سے کانپور ہوتے ہوئے مبارکپور آئے ہوں۔

مبارکپور میں آمد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مبارکپور اور اشرفیہ کی مختصر روداد بھی ذکر کر دی جائے تاکہ تسلسل باقی رہے۔

مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارکپور میں ایک عارف باللہ نے علم کا میکدہ کھول رکھا تھا۔ میخانۂ علم سے صبح و شام مئے دو آتشہ کے چھلکتے ہوئے لبریز ساغر شائقین و طالبین کو پلائے جا رہے تھے۔ وہ مرد حق آگاہ حضور حافظ ملت استاذ العلماء جلالۃ العلم شاہ عبد العزیز محدث مبارکپوری علیہ الرحمہ تھے۔ اس سخت کوش نے مسند تدریس و افتاء کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ مسلسل تگ و دَو کر کے وہابیوں دیوبندیوں سے چار ماہ تک مناظرانہ تقریری مقابلہ بھی کیا تھا۔ جس کے ادلّہ قاطعہ کے سامنے باطل کا کس بل نکل چکا تھا۔ مبارکپور کی سرزمین پر نو سالہ[1] جان لیوا مشقت و محنت کرنے کے بعد، یہاں تک کہ فاقہ کشی بھی کر کے اور ارض مبارکپور کو اپنے سجدوں کی تابانیاں بخش کر مبارکپور چھوڑ کر ناگپور تشریف لے گئے۔ مگر سال بھر کے بعد اہالیانِ مبارکپور نے حضور محدث اعظم ہند اور حضور صدر الشریعہ

---

[1] چونکہ حافظ ملت علیہ الرحمہ ۲۹ ؍ شوال ۱۳۵۲ھ کو اشرفیہ آئے اور شوال ۱۳۶۱ھ کو ناگپور تشریف لے گئے۔ اس طرح کل ۹ سال ہوتے ہیں ۱۲ قمر غفرلہٗ

علیہما الرحمہ سے اصرار بہم کر کے ان کو پھر حاصل کر لیا۔ اور ملت کا محافظ اسی سرزمین پر اپنے علمی جاہ وجلال کے ساتھ رونق دہ انجمن ہوا۔ اب آنے والا آ رہا ہے تو ہمیشہ کے لئے آ رہا ہے اور جب حافظ ملت آئے تو ان کو مبارکپور کی سرزمین سے ایسا پیار ہوا کہ آج بھی اسی دھرتی کے سینہ میں اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ آرام فرما ہیں ـــــــ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

جونکہ اشرفیہ کا علمی فیضان دور دور تک پھیل چکا تھا۔ لہذا حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ بھی مبارکپور حاضر ہوئے۔ اشرفیہ کا ماحول اور یہاں کی آب وہوا موصوف کو راس آگئی تو دل جمعی کے ساتھ مصروف تعلیم ہو گئے، ایک پرشوق اور پاکیزہ جماعت جس کا ہر فرد ذہین وطباع اور حصول علم میں حریص تھا۔ آپ کے ہمدرس طلبہ میں سے جن کے نام فراہم ہو سکے وہ یہ ہیں۔

① مولانا مفتی ظفر علی نعمانی صاحب سید پورہ (بلیا) جو تقسیم ہندوستان کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ فی الحال قومی اسمبلی پاکستان کے ممبر ہیں ② قاری مصلح الدین قندھاری، حیدر آباد دکن ③ شاہ عبدالحق صاحب گجھڑہ والے، ضلع اعظم گڈھ ④ مولانا فاروق صاحب بنارسی ⑤ مولانا قاری رحمت اللہ صاحب ادروی ⑤ مولانا اختر حسن صاحب ادروی

ان کے علاوہ دیگر لوگ بھی تھے، مگر اشرفیہ میں حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ سب میں ممتاز نظر آتے۔

اپنے ایک مضمون میں بحر العلوم حضرت مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ فرماتے ہیں کہ "دار العلوم اشرفیہ کے نمائندہ طلبار کی فہرست نامکمل رہے گی، اگر میں مولانائے ذی جاہ، حقیقت پناہ، معرفت آگاہ حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب بلیاوی کا تذکرہ نہ کروں۔ دبلے پتلے، منحنی قد، معمولی جسم وجثہ کے انسان، آنکھیں بڑی بڑی اندر کو دھنسی، ناک

گال پچکے ہوئے، داڑھی کے بال بیحد معمولی، سامنے کے اوپر والے دانت معمول سے کچھ بڑے۔ میں نے ان کو جوانی کے عالم سے اخیر عمر تک دیکھا۔ مجھ کو وہ جوانی میں بھی بوڑھے نظر آئے۔ صورت وشکل کے اعتبار سے بھی اور متانت وسنجیدگی کے اعتبار سے بھی، علم و تواضع، تدبر ودانائی غرضیکہ ہر اعتبار سے ایک نہایت تجربہ کار اور دردمندانہ روح ان کے سکڑے سمٹے جسم میں ودیعت کی گئی تھی۔ اور ان کی مناسبت سے جسم بھی ع

ساون ہرا نہ بھادوں بھرا،

اب تک دارالعلوم کے فارغ شدگان کی فہرست ہزار کے لگ بھگ پہونچ چکی ہے۔ جن میں ایک سے ایک فاضل، ایک سے ایک کامل، کوئی تقریر کا امام، کوئی تحریر کا بادشاہ، کوئی تدریس کے میدان کا شہسوار، کوئی نظم ونسق کا ماہر، کوئی مناظرہ کا دھنی تو کوئی صلح کا نقیب اور کوئی زندگی کی دوسری راہوں کا قائد، لیکن اس پوری فہرست میں حضرت مولانا "گل سرسبد" اور "وسط العقد" سب کے سب ان کے نیازمند اور سب کے سب ان کے شرمندۂ احسان، سب کے ہمراز اور سب کے دمساز، غمخواری اور احساس کا مجسمہ، ذمہ داری کی تصویر اللہ رب العزت نے دماغ ایسا نکتہ رس اور فکر اتنی رسا عطا فرمائی تھی کہ عام ذہین طلباء کے مزاج کے خلاف ــــ استاذ سے الجھنا کیا معنی؟ اور کوئی الجھے تو یہ اسے جواب دیں، اور استاذ کی طرف سے دفع کریں۔ درس نظامی پر جتنا استحضار ان کو تھا میں نے کم لوگوں میں دیکھا۔ کسی مسئلہ کا ذکر کر دو بس بیٹھے ہی بیٹھے بلا مراجعت کتب فرما دیں .... یہ بات ایسے ہے اور یہ بات ایسے، کوئی

پوچھے حافظ جی! یہ کس کتاب میں ملے گی؟ آپ کا جواب ہوتا۔ فلاں
فلاں کتاب کے فلاں فلاں ابواب دیکھ لو"۔

طالب علمی ہی کے زمانہ سے تقریباً تمام طلبہ کو ہر علم و فن میں مدد دینا، اور تکرار کرانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کے بارے میں مولوی مظفر حسن ظفرادیبی کہتے ہیں۔

"حافظ جی کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ جماعت کا سب سے کمزور طالب علم سمجھ کر اٹھے"!!

اور میرا خیال ہے کہ جماعت کا سمجھدار طالب علم سمجھ جائے تو استاذ کی ذمہ داری ختم۔۔ الغرض مرحوم نے رب العائلہ کی طرح پورے مدرسہ کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی تھی۔۔۔ ان کا ایک کارنامہ فتاویٰ رضویہ کی اشاعت ایک جماعت کے کام پر بھاری ہے۔ غیر معمولی محنت کے عادی اور جد وجہد کو انتہائی منزل تک پہونچا دینے والے انسان حضور حافظ ملت کے تصور الجامعۃ الاشرفیہ کو عملی جامہ پہنانے والوں میں ان کا کردار کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ان کی علمی برتری کا سکہ پورے ہندوستان میں رواں دواں تھا۔ اپنی سوجھ بوجھ اور تجربہ کاری کے لحاظ سے وہ ملت کے عمائدین میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن تواضع اور سادگی کا یہ عالم تھا کہ یہ واقعہ مجھے (حضرت بحرالعلوم کو) زندگی بھر نہ بھولے گا۔۔
۔۔۔۔۔۔ مولانا کو دارالعلوم اشرفیہ میں مدرس ہوئے دسیوں برس گزر گئے تھے اور آپ کی شخصیت علمی حلقوں میں پوری طرح اپنا مقام بنا چکی تھی۔ اس وقت مبارکپور کے ایک سادہ لوح آدمی نے پوچھا۔ مولوی صاحب! توں (آپ) کب تک پڑھیو؟ (کب تک پڑھیں گے) سب لوگ فارغ ہوکر چلے گئے، اور توہری (آپ کی) اب تک پگڑی نہیں بندھی، القصہ۔۔۔۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

کوئی مسئلہ ہو یا کیسی الجھن مولانا کا دماغ اس سے ہار ماننے کیلئے تیار نہیں وہ معمولی معمولی مسئلوں پر اتنا سوچتے تھے کہ ان کے ساتھی اکتا جاتے۔ ہمارے مبارکپور میں ان کی کھٹائی مشہور تھی کہ جو بات حافظ جی کے پاس پہونچی سرد خانے میں پڑ گئی۔ لیکن حقیقت حال یہ نہ تھی۔ ان کو شدت سے اپنے علمی مقام اور شعوری رفعت کا احساس تھا۔ اس لئے وہ کسی معاملہ میں بھی اپنی زبان سے ایسی بات نکالنے کے روادار نہ تھے جس پر انگلی رکھی جا سکے۔ جب ہر پہلو سے انہیں ہر طرح اطمینان ہو جاتا جب ہی وہ کوئی بات کہتے لیکن پھر اس سے ہٹنا بھی مشکل ہوتا" ۔[1]

الغرض آپ اشرفیہ میں اپنی علمی پیاس بجھاتے رہے۔ حصول علم میں استغراق کا حال سب سے نرالا تھا۔ کیوں نہ ہو حافظ ملت علیہ الرحمہ جیسی ندرت بیاں، نکتہ سنج، نقیہ ادر عبقری شخصیت اور آپ جیسا باذوق، محنتی، سخت کوش طالب علم "سونے پہ سہاگہ تھا"۔

ناگپور میں تشریف آوری

جب حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ اشرفیہ مبارکپور سے شوال ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۲ء میں جامعہ عربیہ ناگپور تشریف لے گئے تو علامہ ارشد القادری (جو اس وقت اشرفیہ کے طالب علم تھے) کو از راہ شفقت و نوازش ساتھ لے گئے۔ حضرت کے اشرفیہ سے چلے جانے کے بعد اشرفیہ کی روح نکل گئی اور تعلیمی انحطاط بھی شروع ہو گیا۔ اس لئے حافظ جی کو برداشت نہ ہو سکا کہ ان کی تعلیم میں کسی طرح کا سقم یا نقص پیدا ہو خود بھی جامعہ عربیہ کے لئے تیار ہو گئے مولانا ظفر علی صاحب اور قاری مصلح الدین بھی ساتھ ہو لئے۔ پھر یہ سہ نفری قافلہ علمی تشنگی بجھانے کے لئے ناگپور پہونچا، ان لوگوں کا آخری سال تھا، تعلیم اختتام پر تھی، دورہ حدیث تھا۔ جامعہ عربیہ

---

[1] ماہنامہ اشرفیہ، اگست، ستمبر ۱۹۸۴ء — مفتی عبدالمنان صاحب اعظمی۔

ناگپور رہے۔ اور وہیں مقدس علمائے کرام کے مبارک ہاتھوں سے دستار بندی ہوئی اور علم و فضل کی سند سے نوازے گئے۔ یہ فخر و شرف ناگپور کی سرزمین کو حاصل ہوا۔ اس جلسہ میں ہندوستان کے مسلک اہلسنت کے مقتدر عمائدین اور معزز علمائے کرام نے شرکت کی۔ خصوصیت کے ساتھ مفسر اعظم صدر الافاضل حضرت علامہ مولانا سید محمد نعیم الدین صاحب قبلہ مرادآبادی علیہ الرحمہ متوفی ۱۳۶۵ھ ہجری، صاحب تفسیر خزائن العرفان، صدر الشریعہ بدر الطریقہ حضرت علامہ مولانا مفتی حکیم محمد امجد علی صاحب قبلہ اعظمی علیہ الرحمہ متوفی ۱۳۶۷ھ صاحب بہار شریعت اور گل گلزار اشرفیت خطیب بے نظیر محدث اعظم ہند حضرت علامہ مولانا سید محمد کچھوچھوی علیہ الرحمہ متوفی ۱۳۸۳ھ وغیرہم، ناگپور کی دھرتی پر علم و فضل کے یہ شمس و قمر اپنی تابشیں نثار فرما رہے تھے۔ غالباً جامعہ عربیہ کا یہ پہلا جلسہ دستار فضیلت تھا۔ جس نے سارے ہندوستان میں دھوم مچا دی۔ حافظ ملت کی مسیحا نفسی نے مردہ ماحول میں زندگی کا صور پھونک دیا تھا۔

دستار فضیلت

چونکہ ناگپور اپنی جغرافیائی حیثیت سے وسط ہندوستان میں واقع ہے۔ اس لئے اس کو اس وقت سی، پی (سنٹرل پراونس) CENTRAL PROVINCE کہتے تھے۔ جس کا نام بدل کر بزبان ہندی مدھیہ پردیش (मध्य प्रदेश) کر دیا گیا۔ حضرت علامہ ارشد القادری جو کہ اس وقت جامعہ عربیہ کے ایک ممتاز طالب علم تھے، نے ایک نظم ہدیہ تہنیت بموقعہ جلسہ دستار فضیلت لکھی۔ نظم انتہائی مرصع اور حسب حال تھی۔ جس کا ایک ایک مصرعہ صنعت ایہام کی منہ بولتی تصویر تھا۔ دستار فضیلت کی رسم ادا ہو جانے کے بعد جب یہ نظم پڑھی گئی تو پوری بزم پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ خصوصاً نور یہ کے اس شعر پر تو انہوں نے جلسہ لوٹ لیا۔

ان موتیوں کی تابشیں دنیا کو ہیں محیط ٭ سی، پی میں گرچہ ان کو یہاں دیکھتا ہوں میں

(ارشد)

علم کی گرانمایہ ذمہ دارانہ دستار سر پر باندھ کر حافظ جی علیہ الرحمہ کو لوگوں نے بہت بڑی ذمہ داری اٹھانے کے لئے تیار کر دیا۔ حضرت موصوف علیہ الرحمہ فارغ ہو جانے کے بعد ۱۹۴۲ء میں چند ماہ کے لئے جامعہ عربیہ ہی میں عارضی طور پر مدرس ہو گئے۔ آپ کے ہمسفروں میں سے حضرت مولانا مفتی ظفر علی صاحب بھی جامعہ عربیہ میں ایک دو سبق پڑھاتے تھے۔ اور قاری مصلح الدین صاحب ناگپور صدر کی جامع مسجد میں کئی سال تک فرائض امامت انجام دیتے رہے۔ جب حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ سال بھر کے بعد پھر اشرفیہ مبارکپور تشریف لے آئے تو حضرت حافظ جی وہاں سے خود ہی سبکدوش ہو گئے[۱]۔ پھر وہاں سے حضور تاج العارفین سید التارکین، سراج الفقہا، سیدی آقائی مفتی اعظم ہند متوفی ۱۹۸۳ء علیہ الرحمۃ والرضوان کے فرمان برہان کے قائم کردہ ادارہ دار العلوم مظہر اسلام بریلی شریف میں تشریف لائے۔ بڑی تن دہی سے مصروف کار تھے۔ قطب زماں کی نگاہِ ولایت نے زر کندن کو پرکھ لیا تھا۔ اس لئے اپنے ادارے میں ان کو خصوصی مدرس بنا کر کرم فرمایا۔ ان کے آجانے سے حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کو بہت اطمینان ہو گیا تھا۔ مگر ادھر دار العلوم اشرفیہ مصباح العلوم مبارکپور میں حضور حافظ ملت کی تشریف آوری نے پھر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ اور اشرفیہ جتنا پیچھے گر گیا تھا سال بھر کے اندر اس سے کہیں زیادہ بلند ہو گیا۔ اشرفیہ کو ایک ایسی شخصیت کی تلاش تھی، جو حضور حافظ ملت کی قوت بن سکے۔ آپ کی نگاہ حافظ

---

[۱] یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ناگپور سے فارغ ہونے کے بعد پورنیہ ضلع میں کپڑے کی تجارت کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب حضور مفتی اعظم ہند کو معلوم ہوا تو ان کو بلوا کر اپنے مدرسہ میں مدرس رکھنا چاہا حضرت موصوف کو جب حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کا حکم ملا تو دکان کو ختم فرما دیا اور تمام کپڑوں کو اونے پونے بیچ کر مفتی اعظم کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے ۱۲ مؤلف غفرلہ

جی قبلہ ہو گئی۔ مگر بریلی شریف مرکز سے اور وہ بھی حضور مفتی اعظم ہند کے ادارے سے ان کو حاصل کرنا ایک مشکل امر تھا۔ پھر بھی حافظ ملت بریلی شریف تشریف لے گئے۔ اور سرکار مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ سے حضرت حافظ جی کو منت سماجت کر کے مبارک پور لائے۔ ادھر مفتی اعظم نے اشرفیہ کی علمی اور ترقیاتی لہروں کو بھانپ لیا تھا۔ اس لئے حضرت حافظ ملت علیہ الرحمہ کے اصرار کرنے پر اجازت دیدی — مگر پھر فرمایا کہ

"مولانا عبدالرؤف کا جانا ہمارے مدرسہ کی موت کے مرادف ہے" [۱]

سرکار مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کے اس مختصر سے جملے میں حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کا علمی و انتظامی تشخص بھر پور جھلک رہا ہے۔ نیز ان کی بلند پایہ شخصیت واضح ہو جاتی ہے۔ حضرت کی نگاہ دیکھ رہی تھی کہ علم کی چلتی پھرتی یہ تصویر مستقبل کی رازی و غزالی اور ابن سینا و فارابی بننے والی ہے۔ اس لئے جدائی کے وقت مذکورہ بالا خیال کا ظاہر ہونا فطری تھا۔ قیام بریلی شریف کے دوران تدریسی فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کے پاس افتار کا کام بھی کرتے۔ افتار کی یہی مشق آگے چل کر فتاوی رضویہ جیسی عظیم علمی، فقہی، فنی تصنیف کی ترتیب و تدوین کا اہم کام سرانجام دلاتی ہے۔

نارمل کی ڈگری جہاں آپ علوم دینیہ میں دسترس رکھتے تھے۔ وہیں علم دنیا سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ حضرت علامہ ارشد القادری صاحب بیان فرماتے ہیں کہ

"حافظ جی علیہ الرحمہ نے مڈل بھی پاس کیا تھا۔ اور اس کے بعد ایک ڈگری نارمل (Normal) ہوتی، اس کو بھی پاس کیا۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت کی نارمل ڈگری موجودہ دور کے بی ٹی

---

[۱] ——— حافظ ملت نمبر، ماہنامہ اشرفیہ، ص ۳۷، ۴۳، ۱۲

سی (B.T.C) کے مساوی ہوتی تھی ۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ حضرت موصوف نے یہ ڈگری کب اور کیسے حاصل کی؟ قیاس ہے کہ عربی تعلیم کے ساتھ ساتھ خود زور مطالعہ سے علوم جدیدہ حاصل فرمائے ہوں گے اور ان علوم میں بھی آپ ٹرینڈ تھے۔ اس کی توثیق اس طرح بھی ہو جاتی ہے کہ آپ نے علم فلسفہ قدیمہ پڑھانے کے لئے کُرہ (GLOBE) اور جدید سائنسی آلات منگوا رکھے تھے ۔ اگر علوم جدیدہ سے نابلد ہوتے تو یہ سب کیا معنی؟ بہر صورت آپ علم دین کے ساتھ ساتھ علم جدید سے بھی آشنا تھے ۔

بیعت آپ سلسلۂ عالیہ قادریہ برکاتیہ رضویہ میں حضور مجدد ملّت مفتی العرب والعجم سیّدی اعلیحضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی المولےٰ تعالےٰ عنہ کے بڑے صاحبزادے حجۃ الاسلام حضرت علامہ مفتی حامد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے دست حق پرست پر چھ یا سات سال کی عمر میں داخلِ سلسلہ ہوئے ۔ حضرت مولانا امین الدین صاحب قبلہ ارشاد فرماتے ہیں ۔

"عرس کا وقت تھا ، ان کی عمر کوئی چھ یا سات سال کی رہی ہو گی ، میں اپنے ساتھ لیکر بریلی شریف حاضر ہوا ۔ اس وقت بارش بہت دھوم سے ہو رہی تھی ۔ میں حضور حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ کی بارگاہ میں لیکر پہونچا ۔ اور سلسلہ میں داخل کر لینے کی استدعا کی ۔ حضرت نے سلسلہ میں داخل فرمایا ، اور حسنات کی دعائیں دیں "۔

صاحبِ تذکرہ علمائے اہلسنت مولانا محمود احمد قادری نے حضور صدر الشریعہ علیہ الرحمہ سے بیعت ہونا تحریر کیا ہے ۔ لکھتے ہیں کہ

"بیعت و ارادت حضرت صدر الشریعہ امام امجد علی اعظمی قدس سرہ سے ہے"۔[1]

حضرت مولانا امین الدین صاحب قبلہ کے بیان کے سامنے یہ عبارت کچھ

---

[1] تذکرہ علمائے اہلسنت ، ص ۱۸۱ ، ۱۲

ہلکی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ان کا عینی بیان ہے۔ میں نے (قمر الحسن قمر بستوی) حضرت موصوف سے حضور صدر الشریعہ علیہ الرحمہ سے بیعت کے متعلق استفسار کیا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار فرمایا۔

اب اس صورت میں ممکن ہے کہ حضور حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ کے ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء میں انتقال فرمانے کے بعد حضور صدر الشریعہ علیہ الرحمہ سے طالب ہوئے ہوں۔ کیونکہ حضور صدر الشریعہ علیہ الرحمہ ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۸ء میں اللہ تعالےٰ کو پیارے ہوئے ہیں۔

شادی

بقول حضرت مولانا محمد امین الدین صاحب مرحوم آپ کی شادی ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں بانڈیہہ کے ایک متمول گھرانے میں جناب شیر محمد صاحب کی دختر نیک اختر محترمہ آمنہ بیگم سے ہو چکی تھی۔ یہ امروہہ جانے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ جن کے بطن سے سات اولادیں ہوئیں۔

اشرفیہ میں مدرس

حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی کاوشوں اور کوششوں سے آپ اشرفیہ میں مدرس بنکر تشریف لائے مگر کاموں کی ہماہمی اپنے ساتھ لیکر آئے۔ اور استاذ العلماء کے دست دبازو کی طرح آپ بھی حضرت کے شانہ بشانہ اشرفیہ کی ترقی میں کوشاں رہنے لگے۔ علمی جولانیت نکتہ رسی، تدبر وتفکر، باریک بینی، تعمق نظر، افہام وتفہیم، تدریسی جولانیت، مضمون کی نزاکت، مفہوم کی گہرائی یہ سبھی خوبیاں آپ کو جبلۃً قدرت سے ملی تھیں، اب اشرفیہ ہندوستان میں اپنی مثال آپ ہو گیا تھا۔ شب وروز کی مصروفیت نے آپ کو اتنا سخت کوش اور محنتی بنا دیا تھا کہ تھکنا جانتے ہی نہیں تھے۔

اشرفیہ میں رہتے ہوئے کچھ روز کے بعد حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے آپ کو اپنا نائب منتخب فرما دیا۔ اور آپ نائب شیخ الحدیث کے منصب جلیل پر تاحیات قائم رہے۔ ایک اعلیٰ مدرس کی ساری خوبیاں آپ میں کوٹ کوٹ

کر بھری تھیں، چند کمالات وخصوصیات کی قدرے تفصیل ملاحظہ کریں

کتب بینی

کتب بینی سے علم میں تدریجی ارتقاء ہوتا ہے۔ علم کی جلا کے لئے کتب بینی لازم ہے۔ گویا ترقی علم اور کتب بینی میں ملازمہ ہے۔ جس کا مطالعہ جس قدر وسیع ہوگا اس میں علمی صلاحیت کا اسی قدر نکھار ہوگا۔ اس لئے کہ مطالعہ سے متون وحواشی نیز متعلقات عبارت پر گہری نظر ہو جاتی ہے۔ جس سے مبحث کے سارے عقدہائے لاینحل حل ہو جاتے ہیں۔ حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کی محنت، علم سے تعلق اور کتب بینی کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ آپ کتنا مطالعہ فرماتے تھے۔ زمانۂ طالب علمی سے لیکر تدریس تک اور پھر منصب تدریس پر فائز ہونے کے بعد بھی لگتا تھا کہ آپ کی ساری زندگی مطالعہ کے محور پر گردش کر رہی ہو۔ ان کے طالب علمی کے دور کی محنتوں اور علمی جولانیت کے بارے میں حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے تاثرات کیا تھے جس کو انہوں نے فرزندان اشرفیہ کے سامنے برجستہ فرمایا تھا کہ

"مولانا عبدالرؤف صاحب (علیہ الرحمہ) جس وقت زیر تعلیم تھے، اس وقت ایک دن مولانا ثناء اللہ صاحب میرے پاس آئے اور فرمایا کہ حضرت! عبدالرؤف طالب علم جو ابھی پڑھ رہا ہے یہ تو اسی وقت علامہ ہے۔ بعد میں یہ طالب علم، علم کے کس معیار پر پہونچے گا؟ میری قیامگاہ پر یہ اکثر پہونچتا ہے اور درسی کتابوں کی عبارتوں پر اس طرح کے اعتراضات کرتا ہے، جس کا ذکر ان کتب مطولات میں ہے جن کی اس نے صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔ اور کمال یہ کہ ان اعتراضات کے جوابات بھی خود ہی سناتا ہے۔ تو اکثر جوابات صحیح ہوتے ہیں۔"[۱]

حضرت کی علمی آفاقیت طلبہ سے لیکر علماء تک سب کے نزدیک مسلم تھی۔

---

[۱] ـــــ حافظ ملت نمبر ص ۷۴۳، ۱۲۰۵

اور ان کی دور بینی، کتاب فہمی کا لوہا سبھی مانتے تھے۔ اُلجھے ہوئے مسائل میں اچھے اچھے علما، ان کی جانب رجوع کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس لئے کہ آپ اتنا تشفی بخش جواب دیتے تھے کہ سائل مطمئن ہو جاتا تھا۔ یہ اس لئے تھا کہ آپ علم کی روح میں اتر کر جواب عنایت فرماتے تھے۔ منقول ہے کہ

"دار العلوم حمیدیہ بنارس میں جس وقت علامہ عبد الرؤف صاحب کے وصال کی خبر پہونچی تو شمس العلما، قاضی شمس الدین صاحب جعفری (علیہ الرحمہ) صدر المدرسین حمیدیہ رضویہ بنارس نے کلمۂ استرجاع پڑھنے کے بعد فرمایا آج! ہندوستان سے کتاب کا سمجھنے والا چلا گیا"[1]

کتب بینی اور ذوق مطالعہ کا یہ شوق و شغف انتہا کو پہونچا ہوا تھا۔ مدارسِ عربیہ ہوں یا اسکولس کالجیز سب میں اب یہ مزاج ہو گیا ہے کہ بعض جگہ بغیر مطالعہ (without study) کتابیں پڑھا دی جاتی ہیں۔ اور بعض لوگ جب ایک ہی کتاب کو چند بار پڑھا لیتے ہیں تو پھر مطالعہ کی ضرورت غالباً محسوس نہیں کرتے۔ پھر کتابوں کی جانب سے بے اعتنائی برتنا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر حضرت موصوف کا حال یہ تھا کہ وہ ایک ہی کتاب کو اگرچہ متعدد بار درس دے چکے ہوتے مگر پھر بھی اس کا مطالعہ لازمی سمجھتے۔ درس نظامیہ کی ابتدائی منطق کی چند کتابوں میں قطبی ایک اہمیت رکھتی ہے۔ جہاں سے منطق تعریف کی حدوں سے آگے نکل کر مباحث و افکار کی جانب بڑھتی ہے۔ مولانا محمد حنیف قادری صدر المدرسین دار العلوم تنویر الاسلام امرڈوبھا ضلع بستی کا بیان ہے کہ

ہم لوگوں نے ایک مرتبہ خارجی وقت میں حضرت کو قطبی کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا۔ میں نے پوچھا کہ حضرت! قطبی کا مطالعہ فرما رہے ہیں؟ ارشاد فرمایا، میاں! قطبی منطق کی نحو میر ہے حاشیہ دیکھنے

---

[1] حافظ ملت نمبر ص ۵۴۳، ۱۲

میں کوئی نئی بات مل جائے گی"۔ [1]

کتابوں سے یہ شغل شخصیت کی عبقریت پر دال ہے کہ موصوف علمی مشاغل میں کس قدر منہمک رہتے تھے۔

تفہیم | فہم وتفہیم دونوں الگ الگ معنوں میں استعمال ہونے والے معروف الفاظ ہیں۔ بعض لوگ کتابوں کو سمجھ تو خوب لیتے ہیں، مگر سمجھانے کے ملکۂ راسخہ سے محروم ہوتے ہیں۔ اور بعض لوگ سمجھ کم پاتے ہیں۔ مگر سمجھانے کا ملکہ ان کے اندر معیاری ہوتا ہے۔ لیکن وہ شخص جس کی فہم (سمجھنے کی ملکۂ راسخہ) اور تفہیم (سمجھانے کا ملکہ راسخہ) دونوں ہی معیاری ہوں، ایسے لوگ خال خال نظر آتے ہیں۔ حضرت موصوف علیہ الرحمہ انہیں میں سے تھے۔ فہم وتفہیم دونوں خدادا داور فطری تھی۔ بقول مولانا محمد اسلم عزیزی گورکھپوری

حضرت علامہ عبدالرؤف صاحب کی تفہیم کے متعلق اگر میں کہوں کہ گھول کر پلاتے تھے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ جس سال ہم لوگ شرح جامی بحث اسم پڑھ رہے تھے، خوش قسمتی سے یہ کتاب اس سال آپ ہی سے پڑھتے تھے۔ اس کتاب کی ایک معرکۃ الآرا بحث "حاصل محصول" جس پر مستقل اردو شرح لکھی جا چکی ہے۔ کا سبق ہم لوگ پڑھنے گئے اس بحث کی اہمیت سُن چکے تھے چہروں پر تفکر کا اثر تھا۔ ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گئے کہ حضرت کی اس بحث پر جو تقریر ہوگی وہ پوری یاد کرلی جائے عبارت خوانی سے پہلے فرماتے ہیں......... کیا وجہ ہے کہ تم لوگوں کا چہرہ مضمحل ہے؟ پھر فرماتے ہیں...... اچھا! شاید کسی نے کہہ دیا ہے کہ حاصل محصول کی بحث بہت سخت ہے۔ گھبراؤ نہیں

---

[1] یہ واقعہ میرے زمانہ طالب علمی کا ہے۔ مصباح العلوم کے اندر مولانا موصوف نے بیان فرمایا تھا۔

انشاء المولیٰ الکریم دو لفظوں میں سمجھا دوں گا۔ عبارت پڑھو، عبارت پڑھی گئی۔ پھر اس بحث کی مختصر لفظوں میں ایسی تفہیم فرمائی کہ بفضلہ تعالیٰ اب تک حاصل و محصول کی بحث پڑھانے کے لئے کسی شرح دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ مولانا سلیم اختر مصباحی پورنوی صدر المدرسین مدرسہ اصلاح المسلمین پورنیہ نے چند ماہ پیشتر حضرت استاذ گرامی کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ "حضرت سمجھاتے کیا تھے، مسائل کو ذہن پر ٹاپ کرتے تھے" لہ

مدرس کے لئے سب سے ضروری ہے کہ بچے کی فطرت اور اسکی نفسیات سے واقف ہوکر درس دے، کیونکہ ہر جماعت میں ہر طرح کے طالب علم ہوتے ہیں۔ اگر ایک ہی طرزِ تکلم اختیار کیا گیا تو اعلیٰ دماغ تو اس سے مستفیض ہو سکیں گے، مگر جو دماغ کم ہلکے ہوں گے وہ فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ حضرت موصوف علیہ الرحمہ میں یہ خوبی کامل طور پر موجود تھی۔ درس گاہ میں حاضر بچے کی پیشانی کے خطوط پڑھنے والی نگاہ دل کے سکون و اطمینان اور مدّ و جزر سے آگاہ ہو جاتی تھی کہ کون طالب علم سبق سمجھ چکا ہے اور کون نہیں۔ تشخیص و تجربات نے انکو ایک اعلیٰ معیار کا ماہر مدرس بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ طلبہ تو طلبہ اساتذہ میں بھی ان کی مقبولیت یکساں تھی۔

تدریس

حضرت علامہ موصوف جماعتوں کے طبقاتی مزاج سے بھرپور واقف تھے۔ جیسی جماعت ہوتی اسی کے مطابق اس سے آپ کی گفتگو ہوتی۔ اگر نیچی جماعت ہوتی تو اس کے مزاج کے مطابق ذہن میں اتر جانے والی گفتگو فرماتے تاکہ مبتدی کے ذہن میں تطویل سے حاصل شدہ مفاہیم و مواد گنجلک نہ ہو جائیں۔ چونکہ عموماً ابتدا میں ایسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جن میں تطویل

لہ ——— حافظ ملت نمبر ص ۴۴۵ ۱۲

سے قطع نظر صرف تعریفات ہوتی ہیں، تاکہ مبتدی پہلے تعریفات سے آشنا ہو،
ر مفاہیم و معانی کے تعمق میں جائے۔ اگر کوئی طالب علم ابتدائی کتاب پڑھنے والا،
ونچی بات پوچھتا تو اس کو پہلے نفس مفہوم جو عبارت کی روشنی میں حاصل ہوتا سمجھاتے
ـــــــ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ نور الہدیٰ نامی ایک طالب
علم جو ابھی کافیہ پڑھ رہا تھا، سبق ہو جانے کے بعد کچھ اعتراضات جو اس کے ذہن میں
عبارت کے سلسلہ میں پیدا ہوئے لیکر حاضر ہوا۔ اور ابھی کچھ عرض ہی کیا تھا کہ حضرت
نے فرمایا

میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو، ابھی تمہارا منصب مالہ، و ماعلیہ کو حاصل کرنا نہیں ہے، ابھی تمہارا منصب نفس مسئلہ کو ذہن نشین کرنا ہے جب اعتراض وجواب کی منزل آئے گی تو پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔[۵]

کتابوں کے متون کا حل عموماً شرحوں سے ہوتا ہے۔ کیونکہ ماتن کے اشارتی مفہوم کی تہہ تک شارح کی نظر پہونچتی ہے۔ اور شرحوں کی روشنی میں متنوں کے عقدہائے لاینحل کو حل کیا جاتا ہے۔ لیکن حضرت موصوف علیہ الرحمہ طلبہ کو شروح کے مسائل میں الجھانے کے بجائے متن ہی سے نفس مسئلہ کی ایسی توضیح فرماتے، جو طالب علم کی بساط ذہن کے عین مطابق ہوتی۔ جس سے طالب علم مطمئن ہو جاتا ہر معاملہ میں آپ کا ایک اصول تھا جس کے مطابق وہ کام کرتے تھے۔ چنانچہ تدریس میں بھی آپ کا اصول تھا۔ آپ اسی پر عمل فرماتے اور خود دوسروں کو اس کی تلقین بھی فرماتے ــــــ بحر العلوم حضرت مفتی عبد المنان صاحب قبلہ نے فرمایا کہ

مولانا عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمہ ہر چیز کا اصول رکھتے تھے۔ چنانچہ تدریس میں بھی اسی اصول کے پابند تھے کہ متعلقہ کتاب کی تفہیم شروح

کی روشنی میں نہ کرائی جائے"۔ ؎

ایک کامیاب مدرس کا کمال یہ ہے کہ طالب علم کے سامنے نہ اتنی لمبی تقریر کرے کہ مفہوم خبط ہو جائے اور نہ ہی اتنی مختصر کہ مفہوم میں خفا وابہام رہ جائے۔ وہ ہر کتاب پڑھانے سے پہلے مطالعہ ہی میں ان تمام گوشوں کو اس طرح ترتیب دیتے تھے جو متعلم کی قوتِ ذہنیہ کے عین مطابق ہوتے۔ اس طرح طالب علم کو نہ تو تفصیل اور نہ ہی اجمال میں سر کھپانا پڑتا۔ بلکہ بین بین انتہائی حُسن و خوبی سے مفہوم ذہن میں اتر جاتا۔

انہیں علوم عقلیہ و نقلیہ دونوں پر یکساں عبور تھا۔ حالانکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ اگر کوئی معقولات میں کامیاب ہوا تو منقولات سے اس کا شغف کم ہوتا ہے۔ اور صلاحیتوں کی جو نمو دعلوم عقلیہ میں ہوتی، دوسرے علوم میں نہیں ہو پاتی۔ اسی طرح ایک وہ شخص جو علوم نقلیہ میں مہارت حاصل کر چکا ہو اس کی توجہ معقولات کی طرف کما حقہ نہیں ہو پائے گی۔ مگر حافظ جی علیہ الرحمہ دونوں علوم کے سنگم تھے۔ اس منزل پر میں یہ کہوں گا۔ حضرت موصوف علیہ الرحمہ سیدی امام احمد رضا رضی المولیٰ تعالےٰ عنہ کے ظلِ ظلیل ہیں۔ آپ کا بھی یہی حال تھا کہ علوم نقلیہ کی اتھاہ گہرائیوں میں ایسا ڈوبے کہ پھر اس کے علاوہ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ مگر جب ضرورت پڑی تو علوم عقلیہ کے بھی دریا بہا دیئے۔ یہ فیضان تھا مجدد اعظم کی روحانی نظر کا، فقہ، حدیث، تفسیر، کلام، اصول، بلاغت، معانی، بدائع، منطق، فلسفہ، ہیأت، توقیت، نجوم وغیرہ پر دسترسِ تامہ حاصل تھی۔ یہاں تک کہ معقولات کی منتہی کتابیں اس طرح ذہن میں اتار دیتے کہ کتاب کی دشواری کا احساس ختم ہو جاتا تھا۔

؎ ——— ماہنامہ اشرفیہ حافظ ملت نمبر ص ۴۴ ۱۹۷۵ء

توقیت

علوم عقلیہ کی تمام صنفوں میں توقیت بہت مشکل اور دشوار ہے، آج کل تو عربی مدارس سے اس طرح غائب ہے جیسے کہ کبھی عربی درسگاہوں سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ اسی طرح علم الفرائض سے بھی آجکل اکثر مدرسے خالی ہو چکے ہیں۔ اور جہاں کہیں علم الفرائض پڑھایا بھی جاتا ہے، وہاں صرف اتنا کہ تقسیم سہام کے ابتدائی مسائل حجب، اور عول، تصحیح مخارج اور بس! یہ علوم جن درسگاہوں میں پروان چڑھتے تھے اور جہاں ان کو زینت کا لباس فاخرہ پہنایا گیا تھا اب ان سے روٹھ کر کالجوں اور یونیورسیٹیوں میں جا چکے ہیں۔ خصوصاً علم توقیت میں تو آئے دن جدت طرازیاں ہو رہی ہیں۔ اور یونیورسٹیز اور کالجز میں زلفوں کا روز مشاطۂ عقل شانہ کرتی ہے۔

شعبہ ہائے ریاضی میں علم توقیت کا اپنا ایک مقام ہے۔ اس کے جداول، طول البلد، عرض البلد اور زائچے وغیرہ سب صحیح کرنے کے طریقے ہیں۔ اور منضبط اصول بھی، ہندوستان میں چودہویں صدی ہجری میں امام احمد رضا رضی المولیٰ تعالیٰ عنہ نے اس کے مردہ جسم کو زندہ کیا تھا پھر اس کو مسیحائے زماں ملتے رہے۔ اور یہ علم پروان چڑھتا رہا۔ مگر آجکل پھر انگلیوں پر گنے جانے والے ایسے علماء موجود ہیں۔ بقیہ علماء کا نوے فیصد حصہ اس علم سے محروم ہے۔ ملک العلماء حضرت علامہ مولانا ظفر الدین بہاری متوفی ۱۹۶۲ء علیہ الرحمہ نے اس میں اعلیحضرت کے اصول پر کچھ کام کیا، اور پھر حضرت حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ نے بھی اس میں طبع آزمائی کر کے عبور حاصل کیا۔ حضرت علامہ مفتی شبیر حسن صاحب قبلہ رضوی بستوی مدظلہ العالی ارشاد فرماتے ہیں۔

> حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے اجلّہ تلامذہ میں سے حضور استاذِ گرامی علامۂ زماں، محقق دوراں، امام وقت، حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ ماہر فتاوی رضویہ بھی تھے، منطق و فلسفہ کے امام

اور ارسطوئے وقت بھی، وہ اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ہیئت و توقیت نجوم و حساب کے دقیق سے دقیق مسائل کو حل فرماتے تھے۔ تصریح و شرح چغمینی، امورِ عامہ و صدرا، قاضی مبارک اور افق المبین جیسی کتابوں کے مسائل مستحضر تھے"[1]

علم توقیت کے سلسلہ میں جیسا کہ صاحبِ تذکرہ علمائے اہلسنت نے بیان کیا ہے کہ

"ضلع پورنیہ کے مدرسہ بحر العلوم میں چھ ماہ قیام کر کے حضرت ملک العلماء، مولانا شاہ محمد ظفر الدین فاضل بہار سے ہیئت و توقیت کا درس لیا"[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے حضرت فاضلِ بہار علیہ الرحمہ سے اس سلسلہ میں اکتسابِ فیض کیا ہے۔ مگر حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کے قول کے مطابق اس کی صحت باقی نہیں رہتی۔ حضور سیدی امام احمد رضا علیہ الرحمہ والرضوان نے ملک العلماء، مولانا محمد ظفر الدین کو علم توقیت سے متعلق کچھ اصول نقل کرائے تھے، جن کو حضرت بہاری علیہ الرحمہ نے الجواھر والیواقیت فی علم التوقیت کے نام سے کچھ اضافہ کے ساتھ شائع کرایا، جو علم توقیت میں ایک جواہر پارہ ہے۔ حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ نے اس کتاب سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور علم توقیت میں درک کامل حاصل فرمایا۔ ایک مرتبہ مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم کے کچھ طلبا، حضرت موصوف سے کچھ اصولی باتیں بہ سلسلۂ علمِ توقیت دریافت کر رہے تھے، تو حضرت موصوف نے نصف النہار کا قاعدہ بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"میں نے اس فن کو علم الافلاک اور علمِ حساب کے ذریعہ حاصل کیا ہے

---

[1] مضمون حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ (غیر مطبوعہ) قمر غفرلہٗ

[2] تذکرہ علمائے اہلسنت ص ۱۸۱، ۱۲

۔۔۔۔۔۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اس کتاب (الجواھر والیواقیت فی علم التوقیت) کی بعض عبارتوں پر میرا اعتراض تھا۔ انہیں اعتراضات کے دفعیہ کے لئے مصنف (حضرت علامہ ظفر الدین فاضلِ بہار علیہ الرحمہ) کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ انہیں اعتراضات میں سے ایک یہ ہے کہ نصف النہار کے استخراج کا جو اصول بیان کیا گیا ہے، اس میں ایک قاعدہ جو ہونا چاہئے تھا کتاب میں مذکور نہیں ہے۔ اپنے اس اعتراض کو مصنف کی بارگاہ میں رکھا تو مصنف نے فرمایا کہ آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ میں نے اس قاعدہ کو اس لئے حذف کر دیا ہے کہ اعلیحضرت (علیہ الرحمہ) نے مجھے یوں ہی املا کرایا تھا۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ حضور اعلیحضرت علیہ الرحمہ نے جن لوگوں کو یہ اصول زبانی بتا دیا تھا وہ حضرات تو سمجھ لیں گے اور جنہیں یہ اصول نہیں بتایا گیا وہ کیسے نصف النہار کا استخراج کر سکتے ہیں"؟ [۱]

بریں بنا آپ نے ان تمام مقامات کو حاشیہ میں درج فرما دیا۔ جن سے مستقبل کی نسلوں کے لئے ایک سرمایہ وجود میں آیا۔ اب اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موصوف فاضل بہار کی بارگاہ میں برائے مناقشت تشریف لے گئے تھے نہ کہ برائے حصول علم۔

مہارت کا یہ حال تھا کہ علم توقیت سے متعلق اگر کوئی کسی جگہ کا طول البلد اور عرض البلد نکال کر وقت کا زائچہ طلوع وغروب مرتب کر کے پیش کرتا تو ایک نظر میں تصحیح وتغلیط فرما دیتے۔ اور غلطی کے اہم گوشوں کو واضح فرما دیتے کہ دیکھو یہاں غلطی ہے اور پھر صحت بھی۔

علم ریاضی یہ اگرچہ ایک الگ اور مستقل فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے مگر یہ حکمتِ نظریہ کی ایک قسم ہے۔ علم ریاضی بہت ہی مشکل مگر انتہائی ضروری ہے

[۱] اشرفیہ، حافظ ملت نمبر ——— ص ۵۴۶

مسائل شرعیہ میں اس کی ضرورت، قریب قریب فقہ میں تو اکثر پیش آتی رہتی ہے ــــ علم المیراث جس کو فرائض بھی کہا جاتا ہے یعنی تقسیم ترکہ کا مدار علم ریاضی پر ہے۔ سہام کی تقسیم، تصحیح مخارج اور پھر عصبات کے حصص، رد کا عمل یہ سب کے سب علم ریاضی ہی کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ بغیر اس کے ان مسائل کا حل کرنا ممکن نہیں ــ علاوہ اس کے حوض اور مسجد کی تعمیر وغیرہ میں بھی اس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دہ در دہ کا مسئلہ پورا اسی پر مبنی ہے ــــــــ الغرض شرع مبارک سے ریاضی کا خاص تعلق ہے۔ حضرت موصوف کو ریاضی میں بھی ملکۂ راسخہ حاصل تھا۔ سراجی کے انتہائی الجھے ہوئے مسئلوں کو چشم زدن میں حل کر دیا کرتے تھے۔ فرائض میں آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا ــــــــ مولانا محمود احمد نے تعلیم فرائض کے متعلق لکھا ہے کہ

"فرائض راقم سطور کے استاذ علامہ محمد نظام الدین سابق صدر المدرسین مدرسہ عالیہ رام پور سے سیکھا۔"[1]

اس کی تحقیق نہیں ہو سکی، ممکن ہے موصوف کی طرف رجوع فرمایا ہو، موصوف مرحوم نے تقسیم کا ایک انوکھا طریقہ ترتیب دیا تھا، جس سے لمبی تقسیمیں مختصر سے مختصر ہو جاتیں۔ بلکہ کچھ ایسے اصول وضع کیے جن کا موجد آپ کو کہنا چاہیے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ

"میں نے حساب کے کئی ایک اصول مرتب کیے ہیں۔ ممکن ہے کہ اصول کی کتابوں میں موجود ہوں مگر میں نے دیکھا نہیں ہے"[2]

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف نے ان اصولوں کو بغیر کسی کتاب کی مدد کے صرف اپنے ذہن سے حاصل کیا تھا۔ اور یہ ان کی فطری صلاحیت تھی۔ علم الحساب کی ایک بہت اہم اور انتہائی دقیق مسائل کی کتاب چکر ورتی

[1] تذکرہ علمائے اہلسنت ص ۱۸۱، ۱۲
[2] اشرفیہ حافظ ملت نمبر ۲۴۷ ۱۲

ہے۔ جو پہلے مدارس اور اسکولوں کے تعلیمی نصاب میں داخل تھی۔ مگر پھر خارج از نصاب قرار دیدی گئی۔ حضرت مولانا امین الدین صاحب فرماتے ہیں کہ

"میں نے ابتدائی چند اصول ان کو ازبر کرا دیا تھا۔ بہر حال یہ ہوا کہ جودتِ طبع سے انہوں نے پوری کتاب از خود حل فرمالیا، بغیر کسی کی مدد کے اور ریاضی کی مشکل سے مشکل شکلوں کو اتنی آسانی سے حل کر دیتے کہ لگتا تھا یہ تمام شکلیں ان کی پہلے کی حل شدہ ہیں"۔

جیسا کہ مذکورہ بالا سطروں میں یہ بات واضح ہوئی کہ علم فرائض مکمل ریاضی پر موقوف ہے۔ اور تقسیم سہام میں علم ریاضی پر ہی عمل ہوتا ہے۔ حضرت مولانا اعجاز احمد خاں صاحب قبلہ جو دار العلوم اہلسنت تدریس الاسلام میں زمانہ دراز سے منصب صدارت پر فائز ہیں، نے یوں اظہار خیال فرمایا کہ

"میں علم میراث کا ایک مسئلہ حل کر رہا تھا جو کئی بطون پر مشتمل تھا۔ اس کے حل کرنے میں کئی دن سے پریشان تھا۔ جب بھی حل کرنے بیٹھتا، کچھ دور چل کر الجھ جاتا۔ ایک روز بڑی محنت کر کے کسی صورت سے اس کو حل کیا اور حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کو دکھایا۔ انہوں نے ایک سرسری نظر ڈالی اور انگلی رکھ دی کہ یہ مسئلہ غلط ہے۔ اور فرمایا، دیکھو یہاں پر ایسا ہوگا اور یہ اس طرح"۔

تمارست اور مہارت کا یہ حال تھا کہ اغلاط پر فوری نظر جاتی تھی، اور لگے ہاتھ اس کی صحت بھی فرما دیتے۔

فلسفۂ قدیمہ

فلسفۂ قدیمہ کے اساطین خمسہ بندقلیس، فیثاغورس، سقراط، افلاطون اور ارسطا طالیس کے نظریات کو زیادہ فروغ ہوا لیکن اس میں سے ارسطو ہی کے نظریات کو بنیاد بنایا گیا۔ اسی لئے زیادہ تر شرحیں ارسطو ہی کی کتابوں کی لکھی گئیں۔ اگرچہ سقراط اور افلاطون کا درجہ بھی بہت اونچا

ہے۔ تاہم ارسطو کی بالادستی سب پر قائم رہی۔ اور اسی کی نظریاتی موشگافیوں سے مستقبل کے فلسفہ کی تعمیر ہوتی رہی۔ یہ اور بات ہے کہ آگے چل کر نظریاتی طور پر اسکے بعض خیالات کا بطلان بھی کیا گیا، جیسا کہ زمین کی کشش انجذابی یا حرکت فلک وغیرہ کے سلسلہ میں کیپلر اور نیوٹن وغیرہ کے نظریات ارسطو کے نظریات سے متصادم ہوئے۔ مگر طالیسی نظریات کو ابن سینا اور نصیر الدین طوسی نے ہمیشہ ترقی کی راہ پر گامزن رکھا۔

علمائے اسلام نے فلسفہ قدیمہ کو اوج ثریا تک پہونچایا تھا۔ تاریخ فلسفہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدماء کی راہ پر چل کر مستقبل کی نسلوں نے اس سے زیادہ ترقی کی۔ حضرت حافظ جی کا بھی فلسفہ میں بہت اونچا مقام ہے۔ مفہوم کی نزاکت کو آپ اتنی خوش اسلوبی سے پیش کرتے کہ بات فوری ذہن میں اتر جاتی۔ جزء الذی لایتجزیٰ کی بحث فلسفہ قدیمہ کی خشت اول ہے۔ اس پر اقلیدس میں متعدد دلائل عقلیہ نقل دیے گئے ہیں۔ شکل حماری، شکل عروسی مثناۃ بالتکریر وغیرہ سے بطلان جزء کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا گیا ہے۔ جس کو حل کرنے میں اچھے اچھوں کو پسینہ آجاتا ہے۔ مگر حضرت موصوف کی نوعیت بالکل الگ ہے۔ مفتی شبیر حسن صاحب بیان فرماتے ہیں کہ

"صدرا پڑھاتے وقت جب ابطال جزء کی بحث پر اقلیدس کی اشکال سامنے آئیں تو حضرت نے ان اشکال پر ایرادات قائم فرمائے اور پھر ان کا دفعیہ بھی کیا۔ مگر پھر مسلک حق بیان فرمایا کہ یہ سب فلسفیوں کے واہمے ہیں۔ اور اقلیدس میں اس پر جتنی دلیلیں نقل ہیں سب محل نظر ہیں"

الکلمۃ الملھمۃ میں امام زمن سیدی اعلیحضرت رضی المولیٰ تعالےٰ عنہ نے یہی فرمایا ہے۔ انہوں نے ان تمام اشکال پر ایرادات واعتراضات قائم فرمائے ہیں۔ اور فلسفیوں کے تمام تار و پود بکھیر کر رکھ دیے ہیں۔

شمس بازغہ میں حرکت کی بحث بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ملا محمود جونپوری نے اس بحث میں بے شمار گل کھلائے ہیں۔ اور بحث کی طوالت سے مسائل کو الجھا کر رکھ دیا ہے، جس سے مغلقات کا انبار ہو گیا ہے۔ بلکہ میرے خیال میں نفس مسئلہ کو بجائے ذہن سے قریب کرنے کے اور گنجلک کر دیا گیا ہے۔ لیکن آپ کا طرز یہ تھا کہ پہلے بحث کا خلاصہ بیان فرماتے پھر اس پر اعتراض، ——— مفتی شبیر حسن صاحب فرماتے ہیں کہ

"شمس بازغہ کی بحث حرکت میں ملا محمود نے جتنے مقامات پر ٹھوکر کھائی ہے، حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ ان مقامات کو اجاگر کرتے ہوئے ان پر مزید اعتراضات قائم کرتے، جس سے معلوم ہو جاتا تھا کہ شمس بازغہ کی اس عبارت میں کتنا لوچ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان ایرادات و اعتراضات کو ملا محمود دیکھتے تو ان کو اپنے اقوال سے رجوع کرنا پڑتا، کیونکہ دلیلیں بہت ٹھوس ہوتی تھیں"۔

اس طرح حضرت موصوف نے فلسفیوں کے تفلسف کا پردہ چاک فرمایا، اور زعمائے فلاسفہ جس پر ناز کرتے تھے ان کو بھی منہ کی کھانی پڑی۔ فنون عقلیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اس طرح کے لوگ خال خال نظر آتے ہیں۔

علم سائنس قدیم فلسفہ کی تھیوریوں پر علم سائنس کی بنیاد رکھی گئی ہے ——— نیوٹن اور کیپلر نے اس کو نیا روپ دیا۔ پھر فلسفۂ قدیمہ جدید سائنس بن گیا۔ اگرچہ یہ فن اس دور میں یورپ کا تمغۂ امتیاز بن چکا ہے مگر اس کی گتھیاں سلجھانے والے کسی زمانے میں اہل اسلام ہی تھے۔ جن میں ابن سینا (AVICENNA) کا نام سرفہرست ہے۔ فلسفہ کی تمام ذہنی اور فرضی شکلوں کو جو عربی درسگاہوں میں صرف ضابطہ اور اصول (THEOREM) تک محدود سمجھی جاتی ہیں ——— جدید سائنسدانوں نے عملی جامہ (PRACTICAL)

پہنا کر پیش کیا۔ اور ان کی مقبولیت کا یہ اثر ہوا کہ آج سائنس دنیا کی ایک ایسی طاقت و قوت ہو گئی، جس کے سامنے سبھی گھٹنا ٹیک چکے ہیں۔

حضرت موصوف علیہ الرحمہ بھی سائنس میں معلومات ہی نہیں، بلکہ ملکۂ راسخہ رکھتے تھے۔ بعض بعض مقامات پر وہم و فرض ہی سے نہیں بلکہ اسکو پریکٹیکل کر کے بھی دکھا دیتے تھے۔ مشرقی فکر و نظر میں عصری ترقیاتی منصوبے کتنے عروج تک تھے، کم لوگوں نے اس کو سمجھا۔ ہاں! ارباب علم و نظر یہ برملا اظہار کرتے تھے کہ حضرت موصوف ایک بلند فلسفی اور عمیق نظر سائنسداں تھے۔ جنہوں نے درسگاہی زندگی میں رہ کر علمی میدانوں کی پہنائیاں ناپیں ـــــــ مولانا محمد ادریس لستوی فرماتے ہیں کہ

"علم معقولات کا اگر انہیں امام زمانہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ منطق قدیم و جدید، فلسفۂ یونان و یورپ پر اتنی دسترس تھی کہ ارسطو اور جالینوس بھی اگر ان کے ہم عصر ہوتے تو ان کو اپنا ہم پلہ شمار کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ اکثر حسرت کے ساتھ فرماتے ہمارے پاس مادی وسائل نہیں ہیں، ورنہ آج کے دور میں ہم اپنی ایجادات سے دنیا کو بہرہ ور کر دیتے کہ اہل عالم حیران رہ جاتے۔"

جب ساری دنیا میں یہ خبر عام ہوئی کہ امریکہ کا سائنسداں چاند پر پہونچ گیا ہے۔ تو علماء کے درمیان یہ مسئلہ موضوع بحث بن گیا۔ کوئی رد و ابطال میں دلیلیں لاتا، اور کوئی اس کے مثبت پہلو کو اجاگر کرتا۔ حضرت موصوف علیہ الرحمہ نے فرمایا۔

"کہ جا سکتے ہیں کوئی مشکل نہیں .... میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ کوئی مشکل نہیں ہے اس سے اسلامی معتقدات پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اگر اثر پڑتا ہے تو فلسفۂ قدیمہ پر۔" [۱]

[۱] ـــــــ اشرفیہ حافظ ملت نمبر ص ۵۴۷، ۱۲

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ فلسفۂ قدیمہ کو جدید لب و لہجے میں
پڑھانے کے لئے کچھ سائنسی آلات بھی منگوا لئے تھے تاکہ مستقبل کی جدید نسلوں کو
پریکٹیکل کرکے علمی افکار سے روشناس کرایا جا سکے۔ مگر افسوس کہ عمر نے وفا نہیں
کی۔ اس لئے علم فلسفۂ قدیمہ و جدیدہ کی عملی تحقیق کے مواقع فراہم نہ ہو سکے، افکار
و شعور کا یہ ارتقائی عمل اگر کچھ روز اور رہ گیا ہوتا تو اشرفیہ اپنے جدید فکر و عمل میں
دوسرا جامعہ ازہر ہوتا۔

علم نجوم فنون عقلیہ میں جہاں اور دیگر شعبوں میں آپ نے طبع آزمائی کی تھی
وہیں علم نجوم سے بھی والہانہ شغف رکھا تھا۔ اس میں بھی آپ کو
دسترس تامہ حاصل تھی۔ ستاروں کی چال اور سیاروں کی گردش سے افلاک
کی حالات کا پڑھنا کسی اہل علم کا کام ہو سکتا ہے۔ انوری متوفی ۱۱۸۶ء جیسا
فصیح اللسان قصیدہ گو شاعر جس نے علم نجوم میں اپنا جواب نہیں رکھا۔ جس کی پوری
زندگی علم نجوم کی دلچسپیوں میں صرف ہوئی۔ حضرت موصوف علیہ الرحمہ کے متعلق
یہ بات حد تواتر تک پہونچی ہوئی ہے کہ برسات کی راتوں میں آپ باہر سوتے تو طلبۂ
اشرفیہ بھی باہر سوتے، اور جس روز آپ باہر نہ سوتے تو طلبہ بھی نہیں سوتے،
کیونکہ ستاروں کی حرکتوں سے موسم کے حالات کا جائزہ لے لیا کرتے تھے ــــ
مولانا احمد رضا صاحب مصباحی نے ایک بڑی دلچسپ بات بیان کی ـــ کہتے ہیں:۔

"میرے والد ماجد جناب ماسٹر محمد حنیف صاحب کا جب کبھی مبارکپور آنا ہوتا
تو حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کے گھران کا قیام رہتا۔ ایک بار غالباً ۱۹۶۹ء
میں بلیا سے آئے اور حضرت کے یہاں ٹھہرے، وہ کہتے ہیں رات میں تقریباً
تین بجے میری آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں کہ حافظ جی چبوترے پر ٹہل رہے ہیں،
مجھے سخت تعجب ہوا کہ یہ کوئی ٹہلنے کا وقت ہے ـــــــ میں نے پوچھا
کہ حافظ جی آپ ٹہل رہے ہیں، کیا بات ہے۔ فرمایا کہ آج تک یہ

پڑھتے پڑھاتے چلے آرہے ہیں کہ ایک ستارہ ہے جو شب کو ۳ بجے
طلوع ہوتا ہے اور کوئی دس منٹ بعد غروب ہو جاتا ہے اسی کو دیکھنے
کے لئے جگ رہا ہوں"۔

علم سے وابستگی اور عشق کا یہ حال کہ شب کو نیند آنکھوں سے اڑ جائے۔ یہ عظیم مفکروں کی زندگی میں تاریخ نے بتایا ہے۔ حضرت موصوف چونکہ ایک عظیم اسکالر تھے۔ اس لئے تحقیق اشیاء میں انہماک عشق کی حد تک تھا۔ عمارتِ علمیہ کے یہ سنہرے ابواب اس وقت تک وا رہیں گے جب تک علم کی شہر پناہ میں فکر کی شمع روشن رہے گی، اور ماہرینِ علم و فن پیدا ہوتے رہیں گے۔ ستاروں کی شناخت میں اتنی مہارت تھی کہ مفتی شبیر حسن صاحب فرماتے ہیں۔

"ہیئت و نجوم میں کمال حاصل تھا، کبھی کبھی کرم فرماتے تو کمرہ سے
باہر نکل کر اشرفیہ کی چھت پر تشریف لاتے ستاروں کی شناخت
کراتے، اور ان کے اسماء بتاتے، اور حرکات و کوائف سے
واقف کراتے"۔

قدرت کے مظاہر کے لئے یہ دنیا علامتوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ ہے، علتوں سے معلول کو تلاش لیا جاتا ہے۔ بلکہ علت اپنے معلول پر خود دال ہوتی ہے قدرت نے علوم کو کائنات کی کھلی ہوئی کتاب میں ورق ورق تحریر کر دیا ہے۔ بینا آنکھیں، کھلے دل اور بلند فکریں انہیں اوراق سے معلول کو تلاش لیتی ہیں۔ انہیں بالیدہ فکروں میں سے ایک ذات حافظ جی کی بھی تھی۔ نجوم سے اتنا گہرا ربط تھا کہ عشق تک ہو گیا۔ جب کھلے ہوئے آسمان میں ستاروں کو پڑھتے تھک جاتے تو کلکتہ آتے اور یہاں پر پلانیٹیریم
(برلا بیت النجوم) میں تشریف لے جاتے۔ جس میں سائنسی
اصول پر مبنی ستاروں اور سیاروں پر سیر حاصل گفتگو ہوتی ہے۔ اور

چونکہ یہ ایک ایسا تفہیمی تمثیلی پریکٹیکلی ادارہ ہے جس سے علم نجوم میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس میں گہن لگنے کے علل واسباب، دمدار ستاروں کی وجوہات اور تخلیقی عمل سبھی کچھ دکھایا جاتا ہے۔ اس لئے آپ کلکتہ جب بھی آتے تو اس کا دیکھنا ناگزیر تھا۔

ایک دل چسپ واقعہ کوائف کا علم چونکہ عطائے خداوندی سے بتوسط علت حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح آپ کو علم نجوم میں اتنا درک ہو گیا تھا کہ کبھی کبھار اس کے نقاب کو ہٹا بھی دیتے تھے ——— ایک حیرت انگیز واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ صوفی عبدال[illegible] صاحب روایت کرتے ہیں کہ حافظ جی ہوڑہ تشریف لائے۔ چونکہ گارڈی دان پاڑہ میں صوفی صاحب امامت کرتے تھے ان کی اپنی رہائش گاہ بھی وہیں تھی۔ چونکہ صوفی صاحب کی بگان ہوڑہ میں حضرت قیام پذیر تھے۔ رات میں وہ ایک ستارہ دیکھ رہے تھے تھوڑی دیر دیکھ کر فرمایا کہ آج گارڈی دان پاڑہ میں کہیں چوری ہو گی اور چوری کے بعد چور پکڑا بھی جائے گا۔ ابھی یہ گفتگو ختم ہو ہی رہی تھی کہ بقول صوفی صاحب کے مجھ کو کچھ شبہہ سا ہوا اور میں نے ایک شخص کو گھر بھیجا کہ جا کر دیکھ آؤ، وہ شخص فوراً صوفی صاحب کے مکان پر گیا۔ اور حالات کی تفتیش کی معلوم ہوا کہ صوفی صاحب کی اٹیچی غائب ہے تلاش شروع ہوئی تو چور راہ پر چور کو رنگے ہاتھوں اٹیچی کے ساتھ پکڑ لیا گیا۔

یہ تو ایک واقعہ بطور تمثیل نقل کر دیا گیا ہے۔ ورنہ اگر تحقیق کی جائے تو اور بھی واقعات کے چہروں سے پردہ اٹھے گا جو ابھی تک صیغۂ راز میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور جن کو لوگ نسیاً منسیا کرتے چلے جا رہے ہیں۔

فقہ علم دین کا ایسا ذخیرہ ہے۔ جس میں علوم عقلیہ ونقلیہ کو کوزہ میں دریا بند کر دینے کے مطابق جمع کر دیا گیا ہے۔ فقیہ کی نگاہ بڑی عمیق اور وسیع

ہوتی ہے۔ قرآن مقدس، احادیث کریمہ، اقوال سلف، علم کلام اور علوم جدلیہ سب پر یکساں نظر رکھنی پڑتی ہے۔ کیونکہ جزئیات کی فراہمی، اور علل کا تتبع پھر استخراج مسئلہ انتہائی نازک موڑ ہوتا ہے۔ اسی لئے تو فرمایا گیا ہے کہ مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ —— فقہ کے دامن میں خیر کے انمول ستارے ٹنکے ہوتے ہیں۔ خصوصاً فقہ حنفی جس کو تمام فقہوں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ فقیہ کے ساتھ خداوند قدوس کی خصوصی عنایت شامل حال ہوتی ہے۔ فقہا کی ایک لمبی فہرست ہے۔ چودہویں صدی کے عظیم مجدد امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان متوفی ۱۳۴۰ھ نے فقہ حنفی کی نشاۃ ثالثہ کی اور عصری مسائل جن سے مسلمانوں کا گہرا شغف ہوتا ہے، پر آپ نے علم کے انمول موتی لٹائے، اور کسی مسئلہ کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور نام نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ جن کی خدمات کا صلہ اگر پوری امت مسلمہ مل کر ادا کرے تو نہیں ہو پائے گا۔ وہ ہے حضرت علامہ شاہ حکیم محمد امجد علی اعظمی معروف بہ صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ والرضوان متوفی ۱۳۶۷ھ کی ذات مبارکہ،

انہیں صفوں میں حافظ ملت کے ہردل عزیز شاگرد مولانا حافظ عبدالرؤف صاحب ہیں۔ آپ بھی ایک اعلیٰ فقیہ تھے۔ نقد وجرح اور علل وجزئیات پر آپ کی گہری نگاہ تھی۔ آپ کا معیار اتنا بلند تھا کہ بغیر تحقیق کبھی بھی کوئی بات نہیں کہی۔ جب تک مسئلہ کی نوعیت ہر جہت سے واضح نہ ہو جاتی آپ کا ذہن تیزی سے کام کرتا رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی کبھار کوئی مسئلہ درپیش ہوتا اور آپ اس کی تحقیق میں لگ جاتے تو مہینوں مہینوں گذر جاتے تھے —— بقول حضرت مفتی عبدالمنان صاحب،۔

ہمارے مبارکپور میں ان کی کھٹائی مشہور تھی۔ جو بات حافظ جی تک

پہونچی سرد خانے میں پڑ گئی۔ لیکن حقیقت حال یہ نہ تھی۔ ان کو شدت سے اپنے علمی مقام اور شعوری رفعت کا احساس تھا۔ اس لئے وہ کسی معاملہ میں بھی اپنی زبان سے ایسی بات نکالنے کے لئے روادار نہ تھے جس پر انگلی رکھی جاسکے۔ جب ہر پہلو سے ہر طرح اطمینان ہو جاتا جب ہی وہ کوئی بات کہتے۔ لیکن پھر اس سے ان کا ہٹنا بھی مشکل ہوتا۔ مسائل کا پورا استحضار ہوتا تھا۔ مسئلہ پوچھا گیا اور بغیر کتاب دیکھے فرمادیا کہ فلاں کتاب اور فلاں فلاں باب اور صفحہ دیکھ ڈالو۔ علم فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ علل کے اعتبار سے ایک مقام رکھتی ہے جس میں مصنف نے ہر مسئلہ کو عقلی ونقلی دونوں دلیلوں سے بھرپور مزین کیا ہے مگر اسلوب ذرا گنجلک ہے — اس کا درس دیتے وقت مشکل سے مشکل مسئلہ کی اتنی حسین توضیح فرماتے کہ بات سطح ذہن پر ثبت ہو جاتی ———— مولانا عبدالشکور صاحب اپنے ایک مراسلہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"حمیدیہ رضویہ سے فارغ ہوتے ہی اشرفیہ پہونچا تو خواہش ہوئی کہ فقہ کی عظیم اور مشکل کتاب ہدایہ اخیرین استاذ زمن حضرت حافظ جی کے پاس ہوتی تو کیا اچھا ہوتا، خواہش پوری ہوئی۔ طریقۂ درس حیرت انگیز تھا۔ وہ سخت ترین مسائل کو تسہیل کے سانچے میں اس طرح ڈھال دیتے کہ بالکل روشن ہو جاتے۔ کبھی صغریٰ کبریٰ کی ترتیب سے فقہی نتیجہ نکلتا تو آئینہ کی تصویر کی طرح ذہن میں نقش ہو جاتا۔"

اشرفیہ میں آپ اگرچہ بحیثیت مفتی دارالافتاء میں منصب افتاء پر فائز نہیں رہے تاہم اس سے جدا بھی نہیں تھے۔ دارالافتاء میں حضرت مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ یہ فریضہ انجام دیتے تھے۔ چونکہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ایک مفتی کا

---

۵۱ ———— ماہنامہ اشرفیہ اگست ۱۹۸۴ء ص ۱۵ ۱۲

ہر استخراج و استنباط صحیح ہی ہو۔ کبھی کبھی علتوں کا اشتراک اور جزئیات کی تحقیق میں نوعیت مسئلہ غیر ہو جاتی ہے۔ اس وقت ایک مفتی کی تمام تر ذہنی اور علمی توانائی سمٹ کر ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ ایسے وقتوں میں ایک باریک بین اور نکتہ سنج مفتی کی طرح مسئلہ کا جائزہ لیتے تھے۔
مولانا محمد ادریس صاحب فرماتے ہیں۔

"دارالعلوم اشرفیہ کے دارالافتاء میں ملک و بیرون ملک سے لوگ کثیر تعداد میں استفتاء بھیجتے ہیں۔ اس وقت اگرچہ دارالافتاء کی مستقل خدمت حضرت علامہ بحر العلوم مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ انجام دیتے تھے۔ لیکن تمام اہم فتاوی کا مسودہ حافظ جی کو دکھایا جاتا اور کبھی ضروری مشورہ کے بعد حضور حافظ ملت کی بارگاہ میں سوال و جواب پڑھ کر سنانے کے بعد ان کا اجراء ہوتا۔ اور ہمیں اس بات پر بلاشبہہ فخر ہے کہ اس دور کے کسی بھی فتویٰ پر کسی کو انگلی رکھنے کی جسارت نہ ہوتی"۔

ان سب سے زیادہ نمایاں فتاویٰ رضویہ کی اشاعت ہے۔ جس کے تحت سنی دارالاشاعت کا وجود عمل میں آیا تھا۔ فتاویٰ رضویہ کے مسودے کرم خوردہ ہو رہے تھے۔ آپ نے اس کی طرف توجہ کی اور اشاعت کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھالیا۔ حالانکہ ہند و پاک میں ذی علم اور متدین عالموں کی کمی نہ تھی۔ لیکن بات یہ تھی کہ مجدد اسلام کے مزاج سے کس کا مزاج ہم آہنگ ہے۔ جس کا مزاج ہم آہنگ تھا اس نے اس بوجھ کو اٹھایا۔ فتاویٰ رضویہ کی اشاعت کو اور دیگر مرحلوں سے قطع نظر صرف مسودہ کی کرم خوردہ عبارتوں کا تقابلی جائزہ ہی اتنا زہرہ گداز تھا کہ سوچکر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ مگر آپ نے اس کی اشاعت بھی کی اور کرم خوردہ عبارتوں کو صحیح بھی فرمایا۔ خود فرماتے ہیں۔

"کچھ رسالے اور جوابات ناقص ملے، جنہیں ہم نے اس خیال سے نامکمل ہی شائع کر دیا کہ ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ بعض اوراق کیڑوں نے بُری طرح چاٹ لیا تھا۔ ان میں جہاں جہاں اور کتابوں کی عبارت سے تصحیح ممکن تھی کر دی گئی جہاں تک ما سبق وما لحق سے عبارت بن سکتی تھی بنا دی گئی اور جہاں مجبوری تھی بیاض چھوڑ دی گئی۔ ان سب باتوں کی تفصیل ہم شریک عرض حال کر رہے ہیں۔ مبیضہ کا اصل سے مقابلہ پھر مبیضہ سے کاپی کی تصحیح بعدہٗ پروف کی مطابقت میں پوری عرق ریزی اور نہایت احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ مزید براں پوری کتاب میں جہاں جہاں عربی عبارتیں نقل کی گئی ہیں ان کی تصحیح متعلقہ کتابوں سے حتی الامکان کر لی گئی ہے۔ الغرض نقطہ نقطہ شوشہ شوشہ کی صحت کا خاص خیال رکھا گیا ہے ــــ اور بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ کتاب صحیح اور مسودے کے عین مطابق شائع ہو، پھر بھی اگر کہیں کوئی کمی رہ گئی ہو تو یہ ہماری نظر کی کوتاہی اور بصیرت کی کمی ہوگی۔ اعلیحضرت رضی اللہ تعالٰی عنہ کا دامن اس سے پاک ہوگا"[لے]

علاوہ ازیں فقہی بصیرت اور نفس مسئلہ کا استحضار نیز مسئلہ کا اِنتاجی پہلو ہمہ وقت ذہن میں مستحضر رہتا تھا۔ فتاوٰی رضویہ دیکھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ فہرست کی ترتیب میں کس فقہی تدبر سے کام لیا گیا ہے۔ ایسا نہیں کہ فہرست میں صرف اشاریہ ہو اور بس بقیہ نفس مسئلہ اور مضامین سمجھنے کے لئے صفحات دیکھنے کی ضرورت پڑے۔ بلکہ فہرست دیکھ کر ہی نفس مسئلہ معلوم ہو جاتا ہے ــــ ہاں! دلیلوں کے لئے اب ورق گردانی کی حاجت ہوتی ہے ــــــ

لے ــــــ فتاوٰی رضویہ جلد سوم ص د، ش ۱۲

مولانا محمد ادریس صاحب نے اپنے مراسلہ میں اظہار خیال فرمایا کہ
"اس کے بعد مفصل فہرست مضامین کی تیار کی۔ فہرست کے مطالعہ
سے نہ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کس صفحہ میں کون مسئلہ ہے ـــ
اور اس سے متعلق کیا بحث کی گئی ہے، بلکہ صرف فہرست پڑھنے سے
اصل مسئلہ معلوم ہو جاتا ہے، دلائل و براہین اور مزید تفصیل کے لئے کتاب
کھولنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے"۔

یہ ذہن رسا کا وہ عمق ہے جس میں جھانکنے کے بعد عظیم فقیہ کا جلوہ نظر آتا ہے
اور امام احمد رضا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ آپ ایک
نکتہ رس اور ماہر فقیہ تھے۔ اور علوم عقلیہ کے ساتھ علوم نقلیہ میں بھی اپنی مثال
آپ تھے۔ زمانے کے حالات نے اسے دیکھا ہے اور اشرفیہ کے در و دیوار
تو اس کے شاہد ہیں۔

عمومی حالات ان تمام مذکورہ علوم کے علاوہ منطق میں تو آپ کو ارسطوئے
زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ منطقی جزئیات پر گہری نظر تھی۔ جدلیات
میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ کبھی بھی کوئی مسئلہ ہوتا تو اس کو قیاسات کی روشنی
میں براہین کے ذریعہ حل فرماتے۔ صغریٰ، کبریٰ اور حد اوسط سے نتیجہ نگاہوں کے
سامنے موجود کر دیتے۔ کمال تو یہ کہ مقدمات کی ترتیب بڑی واضح اور شستہ
ہوتی تھی۔ ملا حسن، حمد اللہ، قاضی مبارک، ملا مبین جیسی کتابیں جو منطق کی منتہی
اور معیاری کتابیں ہیں، جن میں منطق اپنی تعریفاتی حدود سے نکل کر مفہوم کی وسعتوں
میں سماتی ہے۔ اور گنجلک مفاہیم جن سے ذہن ابا کرتا ہے انکا اتنے سہل پیرائے
میں درس دیتے کہ دشواریوں کے دامے غلط ہو جاتے۔ اسی طرح حدیث و تفسیر
میں بھی اپنا مثیل نہیں رکھتے تھے۔ تفسیر میں تفسیر بالرائے کے شدید مخالف تھے
اصولِ تفسیر کی روشنی میں تفسیر کا درس دیتے تھے۔ اور ہر مقام کی توضیح بھی فرماتے

نیز اصولی اعتراض کا انتہائی سادہ مگر پُر معنی جواب عنایت فرماتے ـــــ ایک قول کے مطابق

"تفسیر بیضاوی حضرت کے یہاں ہوتی تھی۔ جب صاحب کتاب تفسیر کے ضمن میں فلسفیانہ رنگ اختیار کرتے تو حضرت کا چہرہ اس وقت دیکھنے کے لائق ہوتا تھا۔ کبھی مسکراتے اور کبھی چہرے پر جلال کے آثار نمایاں ہوتے۔ صاحب بیضاوی کے قول کی توضیح فرماتے۔ ہر ممکن ان کے فلسفیانہ افکار کو اسلامی قدروں سے ہم آہنگ کرتے۔ تاہم کہیں کہیں انداز گفتگو بہت تلخ ہو جاتا تھا۔ جہاں مصنفِ کتاب مکمل فلسفہ میں ڈوب چکے ہوتے"۔

علم حدیث میں بھی آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔ حدیث کو اسماء الرجال کی روشنی میں پرکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ احادیث میں ان کا ایک مقام تھا۔ حدیثوں کے تعارض میں تطبیق کا پہلو دلکش اور انوکھا ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں علم جغرافیہ سے بھی آپ کو شغف تھا۔ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی فرماتے ہیں۔

"علم جغرافیہ میں خاصی معلومات تھی۔ درمیان درس کبھی کبھی جب موڈ ہوتا تو جغرافیہ کے اصول بتاتے جس سے جغرافیائی پہلو اجاگر ہوتے"

اخبار بینی کا شوق بھی تھا۔ روزانہ اخبار دیکھتے، اور مستعدی کے ساتھ دیکھتے۔ کیوں نہ ہو، ہوڑہ میں جب طفولیت کا دور تھا اس وقت سے اخبار دیکھتے تھے۔ یہ اور بات ہے اس وقت کا ذہن اخبار بینی سے کچھ فائدہ نہیں حاصل کر سکتا تھا، مگر مستقبل کا اشاریہ ضرور تھا۔ ملکی سیاست سے بھرپور واقفیت رکھتے تھے۔ غالباً اس اخبار بینی کا یہ شغل عمل کی حد تک تھا۔ مولانا کاظم علی صاحب فرماتے ہیں۔

شام کو ۴ بجے اخبار بینی فرماتے، ایسا نہیں کہ کبھی کبھی بلکہ عموماً ایسا ہی

ہوتا تھا۔ اور یہ اخبار بینی عمل کی حد تک تھی"۔
اتنا ہی نہیں، بلکہ اردو ادب سے بھی شغف تھا۔ حالانکہ معقولی مزاج خشک ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف آپ میں علمی خصوصیتیں کلی طور پر مبہم تھیں۔
مولانا کاظم علی صاحب فرماتے ہیں۔
"ایک مرتبہ حضرت مجھ کو سفر میں ساتھ لے گئے۔ میں بہت خوش تھا کہ چلو راستہ میں کچھ استفادہ کا موقعہ ملے گا۔ ہمراہ چلا بس پر بیٹھے، تو کچھ دور علمی درسی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر دیکھا کہ ایک کتاب نکال کر اس کا مطالعہ فرمانے لگے۔ اور بہت انہماک سے دیکھ رہے ہیں۔
میں نے کتاب کا سرورق دیکھا تو ایک اردو ادبی کتاب کا پتہ چلا"۔
اس سے معلوم ہوا کہ اردو مذاق بھی خاصہ تھا جس سے شغف بھی رکھتے تھے لیکن درسی ذمہ داریاں کچھ اس طرح حائل تھیں کہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ درس و تدریس اوڑھنا بچھونا تھا۔
تصنیف و تالیف کا جذبہ بھی تھا، اور ہوتا کیوں نہ؟ کہ درس کی کہنہ مشقی نے ذہن کو علمی ذخیرہ سے بھر دیا تھا، بجائے خود ایک اکاڈمی تھے۔ میرا تو ذہن اس بات کو باور کر رہا ہے کہ موصوف اگر قلم اٹھاتے تو ان کے قلم سے نکلی ہوئی تحریر میں بھی امام احمد رضا علیہ الرحمہ کا عکس جھلکتا۔ اور جس موضوع پر قلم اٹھاتے تو تشنہ نہ رہتا ——— مگر درسی مصروفیت آڑے آئی۔ اور درس کی ہمہ وقت زلف گرہ گیر میں ایسا الجھے کہ غیر کا موقعہ نہ مل سکا، جس کا ان کو بھی احساس تھا۔
مولانا اعجاز احمد خاں صاحب اعظمی صدر المدرسین دار العلوم اہلسنت تدریس الاسلام بسڈیلہ (بستی) بیان فرماتے ہیں۔
"جامعہ ملیہ دلی کے کسی استاذ کا ذکر چل رہا تھا۔ انہوں نے مشکوٰۃ المصابیح کی ایک شرح لکھی تھی۔ جب وہ طبع ہو کر منظر عام پر آئی،

تو ایک نسخہ حضرت کو بھی، ملا حضرت نے اس کو دیکھا۔ ایک سرسری نظر ڈال کر ارشاد فرمایا۔ اگر اشرفیہ مجھ کو چھ ماہ کا موقعہ دے، اور درس وتدریس سے یکسوئی حاصل ہو جائے تو مشکوٰۃ کی ایک معیاری شرح لکھدوں۔"

اسے تعلّی قطعاً نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ یہ تحدیث نعمت ہے اور علم کی وہ بالادستی ہے جس کا اعتراف سب کو ہے۔ گفتگو کا لہجہ بول رہا ہے کہ تصنیف کا جذبہ تھا۔ لیکن وقت نے موقعہ نہیں دیا۔ اسی لئے کوئی تصنیف وجود میں نہیں آئی۔ تاہم فتاویٰ رضویہ کی ترتیب ہی بہت ساری تصنیفات پر بھاری ہے۔ مولانا محمد عبدالمبین نعمانی صاحب اپنے مکتوب میں اسی امر کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ

آپ نے تصنیف وتالیف کا کوئی کام اس لئے نہیں کیا کہ درسگاہ میں رہ کر تدریس وتعلیم میں خوب سے خوب تر کی طرف مسلسل پیش قدمی اور غایت درجہ انہماک نے آپ کو فرصت ہی نہ دی۔ البتہ اس کی اہمیت کو محسوس کرتے رہے۔ جس کا بیّن ثبوت اعلیحضرت امام اہلسنت فاضل بریلوی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے علمی خزینے" فتاویٰ رضویہ" کو کرم خانے سے نکال کر کتب خانے کی نذر کرنے کا وہ عظیم کارنامہ ہے جو ہزارہا تصنیف وتالیف پر بھاری ہے۔"

معاملہ فہمی میں جواب نہیں تھا۔ اہم سے اہم معاملات کو بہت ہی خوش اسلوبی سے حل فرماتے۔ حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان نے اسی وجہ سے اپنی ساری ذمہ داریاں آپ کو سونپ دی تھیں۔ طلبہ کے معاملات جب بھی درپیش ہوتے تو شرعی طور پر مقدمہ کا فیصلہ فرماتے۔ مدعی اور مدعیٰ علیہ کے بیانات سنتے، پھر اس پر باقاعدہ بحث فرماتے ——— مولانا اعجاز احمد صاحب فرماتے ہیں۔

طلباء کے مقدمات پیش ہوتے تو اس پر ایسی بحث فرماتے کہ جیسے کوئی ماہر وکیل جرح و قدح کر رہا ہو، پھر فیصلہ صادر فرماتے تو بالکل حق و صحیح ہوتا، جس سے طلبہ میں کبھی بھی بددلی نہیں پیدا ہوئی۔"

تین اہم کارنامے آپ کی زندگی کے تمام جزئی کاموں کا احصاء ذرا مشکل ہے اگر ان سب کو شمار کرایا جائے تو ضخیم کتاب ہو جائے گی۔ تاہم وہ اہم اہم کارنامے جو آپ کی خصوصیات میں شمار کئے جاسکتے ہیں ان کا ذکر بہر حال ضروری ہے۔ جس کو ماقبل کی سطروں میں کچھ تفصیلی اور کچھ اجمالی طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ اور کچھ آگے کی سطروں میں بیان ہوگا۔ حضرت کی زندگی کے تین ایسے کارنامے ہیں، جن کو بھلایا نہیں جاسکتا بلکہ جلی قلم سے لکھا جائے گا، جس کے لئے انہوں نے اپنی زندگی کی کوئی پروا نہیں کی۔ سفر و حضر، اور مرض و صحت ہر حال میں بس ایک ہی دھن سوار تھی۔ جس میں وہ زیادہ کامیاب بھی ہوئے۔ مولانا نعمانی صاحب فرماتے ہیں۔

"حافظ جی قبلہ علیہ الرحمہ کی زندگی کے تین عظیم کارنامے ہیں۔ ایک تو تدریس و تعلیم کے ذریعہ بہترین مدرسین کو منظر عام پر لانا۔ دوسرے فتاویٰ رضویہ کے قلمی نسخوں کی اشاعت۔ تیسرے الجامعۃ الاشرفیہ (عربی یونیورسٹی) کا خاکہ تیار کرنا۔ تقدیر الٰہی سے آپ نے جلد ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہا ورنہ آپ کے ان تینوں کارناموں میں مزید رنگ آمیزی اور حسن و خوبی پیدا ہوتی۔"

نعمانی صاحب نے جن خصائص کا اظہار کیا ہے۔ ان کا تفصیلی جائزہ آئندہ اوراق میں تفصیل کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے۔

انتظامی امور علمی تفوق کے ساتھ تنظیمی صلاحیتیں کم نظر آتی ہیں۔ تنظیمی صلاحیت والے ذہن کی ساخت ہی الگ ہوتی ہے۔ اس

لئے کہ نفسیاتی طور پر تنظیمی ذہن تدریسی افکار سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتا۔ اور آجکل اسکولوں میں پولیٹکل سائنس POLITICAL SCIENCE کے عنوان سے باقاعدہ اس کا شعبہ ہی الگ کر دیا گیا ہے۔ ترقی کی ہر منزل افکار و نظریات کے درمیان دوری پیدا کرتی ہے۔ اس وجہ سے موجودہ دور میں عموماً ہر ہر شعبہ الگ ہو گیا ہے۔ لیکن خداوند قدوس کی قدرت و عنایت ہی ہے کہ وہ شخص واحد میں بھی جمعیت کی چاشنی پیدا فرما دیتا ہے اور فردی تشخص کو انجمن بنا دیتا ہے۔ حضرت موصوف کی ذات بھی کچھ اسی طرح کی تھی کہ فرد میں انجمن کا کردار ودیعت کیا گیا تھا اور آپ تنہا ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ تھے۔ انتظامی امور میں ان کو کتنا تجربہ اور مہارت تھی اس سے اندازہ لگائیں کہ حضور حافظ ملت نے انہیں سب کچھ سونپ دیا تھا۔ اشرفیہ کا سارا نظم و نسق انہیں کے ذمہ تھا حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق صاحب قبلہ شارح بخاری اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

"جب تک وہ حیات رہے حضور حافظ ملت قدس سرہ نے اشرفیہ کا سارا نظم و نسق اور اصلاح و تربیت ان کے سپرد کر دی تھی۔ اس خصوص میں ان کے امتیاز اور تفرد کی دلیل وہ اجلۂ علمائے کرام ہیں جو آج ملک ہی نہیں پوری دنیائے سنیت کے آفتاب و ماہتاب ہیں ______ آج دار العلوم اشرفیہ جامعہ ہو گیا اسے دار العلوم سے جامعہ تک پہونچانے موصوف کی ذات گرامی کا اتنا دخل ہے۔ جتنا انسان کو انسان بنانے میں دماغ کا ہوتا ہے، اشرفیہ کی تاریخ کے زریں عنوان ہیں حافظ عبد الرؤف"

انتظامی امور کی ساری خوبیاں اور اہلیتیں آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھیں چاہے وہ داخلی انتظامات ہوں یا خارجی ہر ایک میں آپ منفرد نظر آتے ہیں۔

سُنّی دار الاشاعت اور الجامعۃ الاشرفیہ کی تحریکیں اور ان کا عمل ان کی ذہنی
انتظامی صلاحیتوں کی منہ بولتی تصویر ہے۔ وہ داخلی طور پر کتنے مستعد تھے
اس کو جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ خود ہی سمجھتے ہوں گے۔ آپ کے داخلی و
خارجی انتظامات کا حال حافظ ملت سے پوچھئے تو پتہ چلے گا
مولانا محمد ادریس صاحب بستوی فرماتے ہیں۔

طویل عرصہ سے عملاً سیاہ و سفید کرنے والے کی حیثیت سے انہوں
نے دار العلوم کا نظم و نسق چلایا۔ مگر آج تک کسی کو ان کا شاکی نہیں
پایا۔ حافظ جی کی ذات گرامی بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور کالجوں
کے اساتذہ اور شیخ الجامعہ حضرات کے لیے مشعلِ راہ ہے۔"

مولانا موصوف نے ایک مبنی بر حقیقت بات کہی ہے اس میں کوئی دو
رائے نہیں۔ آپ کے ایک سادہ وجود و تشخص میں کیا کیا نہ تھا۔ ان کو
جس جہت سے بھی دیکھا جائے نمایاں اور منفرد نظر آتے ہیں۔ وہ ایک عظیم اسکالر
اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ابھی معلوم نہیں کتنے خوشنما گوشے
دامن خفا میں مخفی ہیں۔

اشرفی دار المطالعہ

انجمن اہلسنت اشرفی دار المطالعہ کی بنا، طلبۂ اشرفیہ نے
۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۵ء میں ڈالی۔ اس وقت کے
جفاکش طلبہ نے اپنی حیثیت کے اعتبار سے ایک انجمن سمجھ کر اس کو معرضِ وجود
میں لانے کی سعیٔ بلیغ کی، جس نے آگے چل کر متعدد انجمنوں کو وجود بخشا، انہیں مربوط
کیا، ساتھ ہی طلبہ کی فکری و علمی نشو و نما کے لئے ایک عمدہ لائبریری بھی قائم کی۔
اس کی تعمیر و ترقی اور منصۂ شہود پر لانے میں سب سے پہلے مولانا قاری محمد
عثمان اعظمی صاحب (مصنف مصباح التجوید) کا نام آتا ہے۔ مگر ان کے ساتھ
ساتھ ان چند منفرد شخصیتوں کا نام بھی ہے جو آگے چل کر بذات خود ایک لائبریری

درسگاہ حافظ عبدالرّؤف علیہ الرّحمہ

مزار پاک حافظ عبدالرّؤف علیہ الرّحمہ
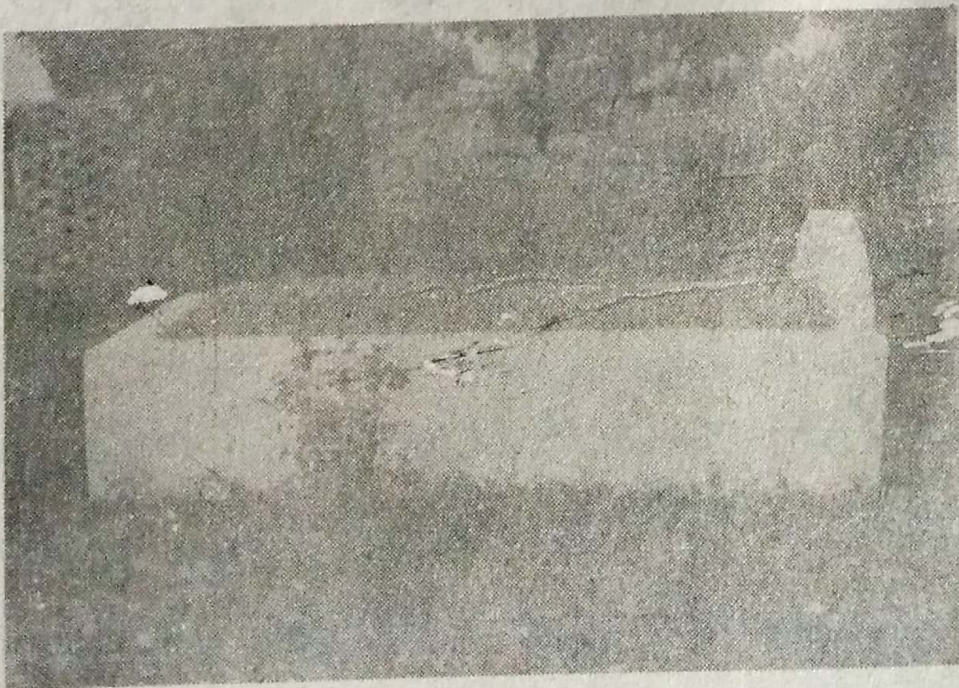
اور ایک انجمن بن گئیں ۔ اس کے متعلق حضرت استاذ گرامی بحر العلوم مفتی عبد المنان صاحب قبلہ انجمن کی ۱۳۸۷ھ میں شائع شدہ رو داد میں رقمطراز ہیں ۔

"آج سے تقریباً ۲۲ سال پہلے دار العلوم اشرفیہ کی نشأۃ ثانیہ کے ابتدائی دور میں جبکہ مبارکپور کا ہر بچہ خدمت سنیت کے نشے میں سرشار تھا ۔ دار العلوم کے پرجوش طلباء نے اپنی ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی ۔ جس کا نام انجمن اہلسنت اشرفی دار المطالعہ رکھا ۔ اس کے بانیوں میں اس وقت کے طلباء میں سرفہرست مولانا قاری محمد عثمان صاحب مولانا صوفی وجیہ الدین صاحب ، مولانا حافظ عبد الرؤف صاحب (علیہ الرحمہ) مولانا علی احمد صاحب وغیرہ تھے ۔" [۱]

ان چند طلبہ میں حافظ جی علیہ الرحمہ کی شخصیت بھی پیش پیش تھی ۔ مستقبل پر نظر ڈالنے والے افراد حال کی بے بسی کا لحاظ کئے بغیر اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتے ہیں ۔ یہی حال ان طلبہ کا تھا جو ایک انجمن کی بنیاد ڈال کر اس کے ستونوں کی نگہبانی کر رہے تھے ۔ اور اپنے خون پسینہ سے اس کو نمو بخشنا ان کا وطیرہ بن چکا تھا ۔ ان کی محنت شاقہ اور سعی بلیغ رنگ لائی ۔ اور اشرفی دار المطالعہ بیش بہا خزانوں کا ذخیرہ بن گیا ۔ آج بھی اس میں ایسے ایسے نادر نسخے ملتے ہیں جو بسا اوقات بڑی بڑی لائبریریوں میں نہیں فراہم ہو پاتے ۔ اشرفی دار المطالعہ کی ترقی اور پروگراموں کے تدریجی ارتقاء کے متعلق حضرت بحر العلوم تحریر فرماتے ہیں ۔

"مذکورہ بالا حضرات نے کسی دن یونہی باتوں باتوں میں یہ رائے رکھی کہ امسال بارہ ربیع الاول شریف کے موقعہ پر جلوس عید میلاد النبی

---

[۱] ــــــ حافظ ملت نمبر ص ۳۴۳ ۱۲

(صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) نکالا جائے۔ بس کیا تھا ایک اچھے خطاط قاری محمد عثمان صاحب موجود تھے ہی، بس ایک بڑے سے پٹھے پر جلی قلم سے آیت مبارکہ قَدْ جَآءَ کُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ اور ایک شعر:

آؤ ملکر ہم منائیں جشن میلاد رسول ؎ آج کے دن مالک خلد بریں پیدا ہوئے

لکھا گیا۔ کچھ جھنڈے جھنڈیاں تیار ہوئیں۔ اور ۱۲ ربیع الاول کی صبح کو آگے آگے مولوی علی احمد صاحب (علیہ الرحمہ) اور ان کے ساتھ ہی قاری محمد عثمان صاحب نعت خواں جماعت کے سربراہ اور چند خوش گلو طالب علم مذکورہ بالا شعر پڑھتے ہوئے گھوم آئے۔ آئندہ سال سے اس جلوس میں قصبہ والوں کا اشتراک بھی بھرپور رہا اور گیارہ کی شام کو ایک جلسہ بھی ہونے لگا"[۱]

سُنّی دارالاشاعت

حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کے بے شمار کارناموں میں سے ایک سُنّی دارالاشاعت مبارکپور کا قیام بھی ہے جس کی بنیاد ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۹۵۹ء میں رکھی گئی۔ جس کے بانی اور روح رواں حضرت موصوف علیہ الرحمۃ والرضوان ہی تھے۔ اس کے قیام کا ایک بنیادی اور اہم مقصد امام زمن سیدی اعلیٰحضرت رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی غیر مطبوعہ تصانیف کو عموماً اور فتاویٰ رضویہ کو خصوصاً طبع کرانا تھا۔ جس کے لئے آپ نے ہر ہر پریشانی اور مصیبت مول لینا گوارا کر لیا تھا۔ اس کے قیام کی علّت جیساکہ حضرت موصوف علیہ الرحمہ نے خود بیان فرمایا۔ تحریر فرماتے ہیں کہ

"فتاویٰ رضویہ آپ کی (سیدی اعلیٰحضرت علیہ الرحمہ) زندگی کا عظیم و گرانقدر سرمایہ ہے۔ پھر افادیت کے لحاظ سے ہندوستان گیر ہی

---

[۱] حافظ ملت نمبر ص ۲۴۲ ۱۲

نہیں عالمگیر بھی ہے۔ اس لئے مدت سے اسکی اشاعت کی تمنا تھی کہ علماء اور عوام دونوں ہی اس سے مستفید ہوں۔ جس کے لئے بیشتر احباب اہلسنت کو آمادہ بھی کرتے رہے لیکن وہ جو کہا گیا ہے کل امر مرھون باوقاتہٖ وہ مبارک گھڑی اس وقت آئی۔ جب ایک دفعہ شہزادہ اعلیحضرت حضور مفتی اعظم ہند مولانا شاہ مصطفےٰ رضا خاں صاحب (رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ) دار العلوم اشرفیہ مبارکپور تشریف لائے۔ ان سے عرض کی گئی فتاویٰ رضویہ کی اشاعت کا کوئی انتظام ہوا؟ آپ نے فرمایا تم لوگوں کے سوا کس سے اس کی توقع ہو سکتی ہے۔ اس کرامت آثار جملے نے دلوں میں ہمت اور عزائم میں استواری پیدا کی اور دار العلوم اشرفیہ کی رہنمائی میں کام شروع ہوا، اور سُنّی دار الاشاعت کی بنیاد رکھی گئی"[1]

سیدی حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کے حکم بافیض کرامت نے "سُنّی دار الاشاعت" کی بنیاد رکھوائی اور حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ اس کے ناظم ہوئے۔ فتاویٰ رضویہ کی جلد سوم انتہائی دیدہ زیب صاف ستھری گلیز کاغذ پر ۲۲ × ۱۸/۴ سائز کے ۸۱۶ صفحات پر مشتمل ۸۴۲ فتاوی نیز ۱۵ رسائل کی شمولیت کے ساتھ صفر المظفر ۱۳۸۱ھ مطابق جولائی ۱۹۶۱ء سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ موصوف کی قوت ارادیہ اتنی مستحکم تھی کہ حادثات سے دوچار ہوکر بھی شکست کھانا نہیں جانتے تھے۔ سُنّی دار الاشاعت آپ کی خدمت کا آئینہ دار ہے۔ فتاویٰ رضویہ کی تحقیق و تنقیح میں آپ نے کتنی محنتوں کو صرف کیا ہے وہ آپ کے ان جملوں سے ظاہر ہے۔

---

[1] فتاویٰ رضویہ جلد سوم ص ۱۲

"کچھ رسالے اور جوابات ناقص ملے جنہیں ہم نے اس خیال سے نامکمل ہی شائع کر دیا کہ مالا یدرک کلہ لا یترک بعضہ۔ بعض اوراق کیڑوں نے بری طرح چاٹ لیا تھا۔ ان میں جہاں جہاں اور کتاب کی عبارت سے تصحیح ممکن تھی کر دی گئی۔ جہاں تک ماسبق اور مالحق سے عبارت بن سکتی تھی بنا دی گئی اور جہاں مجبوری تھی بیاض چھوڑ دی گئی۔ ان سب باتوں کو ہم شریک عرض حال کر رہے ہیں۔ مبیضہ کا اصل سے مقابلہ پھر مبیضہ سے کاپی کی تصحیح، بعدہٗ پروف کی مطابقت میں پوری عرق ریزی اور نہایت احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ مزید براں پوری کتاب میں جہاں جہاں عربی عبارتیں نقل کی گئی ہے انکی تصحیح متعلقہ کتابوں سے حتی الامکان کر لی گئی ہے" [۱]

ان امور پر غور کرنے سے سنی دارالاشاعت کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ موصوف ہی کا کام تھا کہ "حق بہ حقدار رسید" کے مصداق ان کو ملا۔ فتاویٰ رضویہ جیسی علمی، دینی اور فقہی خزانوں اور جزئیات سے مملو تصنیف جو امام زمن سیدی اعلیٰحضرت رضی المولیٰ تعالیٰ عنہ کا وہ علمی شاہکار ہے جس میں غوطہ لگانا سب کے بس کی بات نہیں۔ اس میں وہی غواصی کر سکتا ہے جو ان کے علمی مزاج سے آشنا ہوگا۔ جیسا کہ اوپر کی عبارت سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ سنی دارالاشاعت کا کام سیدی اعلیحضرت کی دیگر تصانیف کی اشاعت عموماً، اور فتاویٰ رضویہ کی اشاعت خصوصاً تھا۔ چنانچہ جب تک حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ حیات رہے، اس وقت تک اس سے یہ کام بخوبی ہوتا رہا۔ جب فتاویٰ رضویہ کی جلد سوم اس ادارے سے منظر عام پر آنے کے قریب ہوئی تو موصوف کی خوشیوں

---

[۱] فتاویٰ رضویہ جلد سوم ص، ش ۱۲

کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جس کا اندازہ ذیل کی عبارتوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ادارے کی کامیابی اور اس کی علتِ غائی پر روشنی بھی پڑتی ہے۔

"اسی طرح بہت سارے مشکل مرحلوں سے گذر کر یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں پہونچ رہی ہے۔ اگر قوم نے ہماری ہمت افزائی اسی طرح جاری رکھی تو نہ صرف فتاویٰ رضویہ بلکہ سُنّی تصنیف و تالیف کے ایک عظیم ادارے کی داغ بیل پڑ چکی ہے انشاء اللہ" [۱]

فتاویٰ رضویہ اپنی اشاعتی منزل سے گذر رہا تھا۔ جب جلد سوم شائع ہوگئی، اور اس کا ایک نسخہ سید التارکین، تاج الاولیاء، خاتم الفقہاء، حضور سیدی مفتی اعظم علیہ الرحمہ کی بارگاہ میں پیش کیا گیا تو حضرت کے اس جملے کی توثیق ہوگئی جو اس اشاعتی ادارے کے قیام سے پہلے اس زبان فیض ترجمان سے نکلا تھا۔

"کہ تم لوگوں کے سوا کس سے اس کی توقع ہوسکتی ہے"۔

حضرت نے اس کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا، اور اس پر کتنی دعائیں دیں کچھ شمار نہیں کیا جاسکتا۔ خود موصوف علیہ الرحمہ کی زبانی سنئے۔

ویسے خود ہماری آسودگی خاطر اور طمانیت قلب بلکہ ساری جد وجہد کا ثمرہ خوشگوار وہ پُر تعطف تبسم زیرِ لب تھا، جو اسی کتاب کی جلد ہاتھ میں لیکر حضور آقائی و ملاذی حضرت مفتیٔ اعظم ہند دامت برکاتہم خلف الصدق اعلیٰ حضرت کے لب پر دیر تک رقصاں رہا۔ اور یہ اطلاع کہ حضرت مہینوں تک اسے سرہانے رکھے رہے، اور بار بار مطالعہ فرماتے رہے ——— یہ اور بات ہے کہ ناظرین اسے زیادہ اہمیت نہ دیں، لیکن خود ہمارے لئے یہ بجد اہم بات ہے"۔

[۱] ——— فتاویٰ رضویہ جلد سوم ص مش ۱۲

ع "لطف ایں مئے نشناسی بخدا تا نہ چشی" [1]

ان واقعات سے حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کی کاوشوں کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اور سنی دارالاشاعت کی کامیابیوں کا نمایاں پہلو سامنے آجاتا ہے نیز اس اشاعتی ادارے کی ترقی سے حضرت موصوف علیہ الرحمہ کی دل بستگی بھی واضح ہوجاتی ہے کہ درس و تدریس میں مصروف رہ کر اتنا بڑا کام کر گذرنا بہت دل گردے کا کام ہے جبکہ اس کو کرنے کیلئے ایک سے ایک آدمیوں کی ضرورت پڑتی مگر وہ تھے کہ نہ تھکنے والے۔ بحر العلوم حضرت مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ نے جب پانچویں جلد کی تدوین و تبویب کرنی شروع کی تو کاموں کی اہمیت کا اندازہ ہوا، فرماتے ہیں کہ

"مولانا عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ اکیلے ہی سب کام کر لیا کرتے تھے اس لئے ہم لوگوں کو کچھ احساس نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب جبکہ کام سے سابقہ پڑا تو معلوم ہوا کہ کام کتنا مشکل اور زہرہ گداز ہے" [2]

تیسری جلد کی اشاعت کے بعد چوتھی جلد جب منظر عام پر آگئی تو اس سے پہلے فتاویٰ رضویہ جلد سوم کی پذیرائی اس قدر ہوچکی تھی جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ حضرت موصوف کی محنتوں کا ثمرہ ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اور سنی دارالاشاعت کا مقصد متشکل ہوکر سامنے موجود، جس سے اس ادارے کی قدر و قیمت واضح ہوچکی تھی۔ چنانچہ جلد چہارم کی اشاعت اسی پر ہوئی حضرت موصوف علیہ الرحمہ جلد چہارم کے عرض ناشرین تحریر فرماتے ہیں۔

"محرم ۱۳۷۹ھ مطابق جولائی ۱۹۵۹ء میں فتاویٰ رضویہ جلد سوم کا اہتمام

---

[1] فتاویٰ رضویہ جلد چہارم ص، ص ۱۲

[2] فتاویٰ رضویہ جلد پنجم ص، ف ۱۲

شروع ہوا۔ ۲۷/صفر ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۰/اگست ۱۹۶۱ء میں کتاب منظرعام پر آگئی۔ جس وقت کتاب شائع ہوئی ماحول انتہائی تاریک حالات بیحد مایوس کن اور ہمت شکن تھے۔ خود ناشر کو یہ بھروسہ نہیں تھا کہ ایسی ضخیم اور خالص علمی کتاب نکل سکے گی؟ اسی لئے اس وقت دام بھی تقریباً لاگت کے برابر رکھا گیا تھا۔ اور عام تاجرانہ اصول کے خلاف کمیشن وغیرہ کا جھگڑا ختم کر دیا گیا تھا۔ لیکن اپنے ربِّ کریم کا کتنا شکر ادا کریں کہ شعبان ۱۳۸۲ھ یعنی ڈیڑھ سال کی مدت میں ہمارے پاس کتاب کے تقریباً ڈیڑھ سو نسخے رہ گئے۔ جسے ہم نے اس لئے روک لیا کہ جلد چہارم کے ساتھ بھی کچھ لوگ اس کی فرمائش کر سکتے ہیں ——— یہ ایک عام پذیرائی تھی جو برادران اہلسنت کی طرف سے اعلیحضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کے اس شاہکار کی ہوئی۔ خود مہتمم سُنّی دارالاشاعت کو اس سلسلہ میں کتنا سراہا گیا اور ملک کے طول و عرض میں ناشر فتاویٰ رضویہ کی حیثیت سے کتنا اعزاز کیا گیا۔ بیان سے باہر ہے“ [۱]

حضور مفتی اعظم ہند کی الرحمۃ والرضوان کی زبان فیض ترجمان سے نکلے ہوئے کلمات نے قبولیت کی وہ منزل حاصل کی۔ اور حافظ جی کی جانفشانی نے وہ کارنامہ انجام دیا کہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ اشاعتی ادارہ حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کی ذات کا پورا مظہر ہے۔ گویا اس کو آپ سے علاحدہ کر کے سوچا ہی نہیں جا سکتا۔

الجامعۃ الاشرفیہ (عربک یونیورسٹی)

یہ ادارہ بالتدریج اپنی منزل تک پہونچا ہے۔ قصبہ مبارکپور میں

---

[۱] فتاویٰ رضویہ جلد چہارم ص، ف ۱۲

ادارہ کی تینوں عمارتیں منھ بولتی خود ہی ایک تاریخ ہیں ۱۹۰۸ء میں مبارکپور کے حساس اور دیندار غریب مسلمانوں نے سب سے پہلے "مدرسہ لطیفیہ مصباح العلوم" کی بنیاد ڈالی ۔ مگر یہ ادارہ مکتب سے آگے نہ بڑھ سکا۔ پھر جب حافظ ملت علیہ الرحمہ مبارکپور میں تشریف لائے تو ایک اور ادارہ کی داغ بیل ڈالی گئی ——— چونکہ شیخ المشائخ حضرت سید شاہ علی حسین صاحب اشرفی میاں علیہ الرحمہ اور دیگر بزرگوں کی روحانی تاثیر سے مبارکپور میں دینداری بھرپور تھی ۔ پھر کیا تھا ایک عارف باللہ کی مسیحا نفسی اور ایک جلالۃ العلم کے علم وفضل کے اثرات نے فقیہ اعظم حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے خواب کو عملی جامہ پہنا دیا ۔ اور ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء میں باغ فردوس کے تاریخی نام سے ادارے کی نشأۃ ثانیہ ہوئی ۔ اب مدرسہ لطیفیہ مصباح العلوم دار العلوم اشرفیہ مصباح العلوم مسمیٰ بہ نام تاریخی باغ فردوس وجود میں آیا ۔ ایک ولی کامل کی نگاہ دوربیں مستقبل کے آثار و قرائن سے ادارے کی ترقی محسوس کر چکی تھی ۔ پھر چالیس سال بعد علم کے تیسرے قلعہ کا منصوبہ بنایا گیا ۔ اور قصبہ مبارکپور سے باہر تقریباً ایک میل کی دوری پر ۲۳½ ایکڑ آراضی حاصل کر کے ایک نیا شہر بسایا جانے لگا ۔ اور ۱۹۷۱ء سے لیکر ۱۹۷۳ء کے درمیان اس ادارے کی نشأۃ ثالثہ ہوئی ۔ اور ایک عظیم دینی دانشگاہ الجامعۃ الاشرفیہ (عربک یونیورسٹی) وجود میں آئی ۔

دار العلوم اشرفیہ مصباح العلوم سے الجامعۃ الاشرفیہ کی طویل مسافت میں بہت اہم اور مبارک شخصیتوں کا ہاتھ ہے ۔ جہاں حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی جانگداز محنتوں نے کام کیا ، وہیں حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کی شخصیت بھی کلیدی درجہ رکھتی ہے ۔ اس دانشگاہ کے فروغ میں ایک تاریخ ساز مجاہد کی سعیٔ پیہم ، ایک ولی کامل کے سوز نفسی اور دعائے نیم شبینہ کو جہاں دخل ہے ، وہیں ایک مظلوم

فلسفی اور مستقبل کے معمار کی قوتِ فکریہ کا بھی اثر ہے۔ اشرفیہ کو ایک عظیم دانشگاہ میں تبدیل کرنے کی راہ میں حافظ جی علیہ الرحمہ کے فکر و تدبر، ان کی شب بیداریٔ محنتوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ایک بیان کے مطابق،

"چالیس سال کے بعد ۱۹۶۹ء میں حافظ ملت علیہ الرحمہ نے اپنے ارشد تلامذہ، عقیدت مندوں اور نیاز مندوں کے سامنے عربی یونیورسٹی کا عظیم الشان منصوبہ پیش فرمایا"۔[۱]

جلالۃ العلم حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے منصوبہ بنا کر پیش فرما دیا کہ ایک عظیم عربی دانشگاہ بنانا ہے۔ مگر مستقبل میں اس کی رکاوٹ پر مصروفیت کے باعث غور نہیں فرمایا۔ لیکن جس مفکر کی بصیرت ایک یونیورسٹی کے خاکے کو وجود دے سکتی ہے وہ اس کی آنے والی رکاوٹوں کو بھی دیکھ سکتی ہے۔ اور موانع وحلِ موانع پر نظر کا مرتکز ہونا ہی اس کی دوراندیشی کی دلیل ہے۔ منصوبہ جلالۃ العلم نے تیار کیا، اور اس کی نقشہ کشی حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ نے کی۔ چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں۔

"حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے جب دارالعلوم اشرفیہ کے سلسلے میں اپنا خیال ظاہر فرمایا تھا کہ میرا خیال ہے کہ دارالعلوم اشرفیہ کو الجامعۃ الاشرفیہ کی شکل میں منتقل کر دوں۔ اس وقت میں نے اس کے بہتر نتائج پر غور کیا ہی تھا۔ راستہ کی دشواریوں اور رکاوٹوں کا بھی ایک خاکہ بنا لیا تھا۔ حافظ ملت نے اپنے منصوبے کی تکمیل میں جتنی مسافت طے فرمائی ہے اتنی مدت میں جن رکاوٹوں کے حائل ہونے کا میرے ذہن نے فیصلہ کیا تھا۔ وہ ساری باتیں یکے بعد دیگرے

---

[۱] ماہنامہ اشرفیہ جولائی اگست ۱۹۸۵ء ص ۱۲، ۳، ۲

سامنے آتی گئیں ۔ مگر الحمد للہ کہ ان کی مدافعت کی صورت بھی ہم نے
سوچ رکھی تھی اس لئے ہمارے عزائم میں پستی نہ آسکی" ۵

اس عبارت کی روشنی میں یونیورسٹی کی پلاننگ واضح ہو جاتی ہے ۔ مگر
یونیورسٹی کے تمام جامع منصوبے حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ ہی کے تھے خود حضور
حافظ ملت علیہ الرحمہ نے حضرت موصوف کی وفات حسرت آیات پر غم واندوہ کا
اظہار فرماتے ہوئے ، اور یونیورسٹی کے سلسلہ میں موصوف کی فکری بصیرت ، او
دوراندیشی کو اجاگر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ۔

"میں نے خدمتِ دین کے ایک بڑے فریضہ کا بوجھ اپنے ناتواں
کاندھوں پر اٹھایا ، اور عربی یونیورسٹی کی تاسیس وقیام کا ایک جامع
منصوبہ عمل میں آیا ۔ اس سلسلے کی تمام کوششوں اور کاوشوں میں
ہمہ وقت مصروف رہنے والے مولانا عبد الرؤف صاحب ہی تھے
بلکہ جامعہ کا خاکہ انہیں کا تیار کیا ہوا تھا ۔ گو کہ ان کے مصاحبین و
رفقاء کار نے اس بارے میں ان کی بڑی مدد فرمائی ۔ تاہم انہیں
خطوط پر عملی اقدام ہونے والے تھے ۔ اب جبکہ ان کے خاکے کے
مطابق عمل وپیش قدمی کا وقت آیا تو وہ اچانک اس دار فانی سے
رحلت کر گئے ۔ وہ میرے دست وبازو تھے اس لئے ان کے انتقال
کے بعد میں بہت مایوسی کا شکار ہوا ۔ لیکن قدرت الٰہی نے میری رہبری
ویاوری فرمائی ۔ پھر ذہن میں آیا کہ یہ دنیا کارگاہ عمل ہے ۔ یہاں کتنے
عظیم سے عظیم اور کتنے بڑے مدبر و منتظم آئے اور چلے گئے ۔

ع ..... ہزار شمع بکشتند وانجمن باقیست

لیکن دین کا کام تائیدِ الٰہی سے جاری رہا۔ مجھ کو مایوس ہو کر اس بڑے منصوبے سے دستبردار نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ ادارہ کی تعمیر و ترقی کے لئے اپنی جہد و سعی جاری رکھنا چاہیئے" [۱]

حضرت موصوف علیہ الرحمہ کے متعلق حضورِ حافظِ ملت کے یہ تاثرات ان کی شخصیت کی آفاقیت کے لئے بہت ہیں۔ نیز ان کے حزم و عزم کی راسخیت کا اندازہ اس سے لگتا ہے۔ اور پھر اشرفیہ کے سلسلہ میں ان کے خیالات کتنے بالیدہ اور ترقی پسند تھے کہ جامعہ کی تعمیر و ترقی میں آپ کا کردار کلیدی ہو گیا۔ یہ اس سخت کوشش مردِ مومن کے ذہنی خاکوں کا ثمرہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کو ایک عظیم دینی درسگاہ میسر ہوئی۔

خصائل

علم کا جبلِ شامخ اور موجیں مارتا ہوا سمندر، جو رازی و غزالی کا مظہر اور ابن سینا و فارابی کی گتھیوں کو سلجھانے والا اور معقولات و منقولات کے دریا بہانے والا، ان دیکھی نظریں اس کا طمطراق، رعب و جلال، چہرہ بُشرہ، وضع قطع کے لحاظ سے اسے ایک وجیہ، قدآور، سراپا تصور کرتی ہوں گی۔ مگر قدرت کی دستکاری اور کرشمہ سازی پر آفریں کہہ اٹھے کہ یہ سب کچھ نہیں تھا۔ نانِ جویں پر قناعت کرنے والا، علم کا رسیا، نحیف و نزار، دبلا پتلا اور انتہائی متواضع المزاج، خاکساری و انکساری کا پیکر، لباس کوئی زرق برق نہیں، حرص و ہوس کا دور دور تک پتہ نہیں، تصنع سے دور، بڑی سادہ اور انتہائی دلگیر زندگی گذار گیا۔ بقول کسے

"وہ بڑی آب و تاب اور شان و شکوہ کے ساتھ رہنے کے عادی نہ تھے، جس سے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے ان میں کشش

---

[۱] ماہنامہ اشرفیہ جولائی اگست ۱۹۸۵ء ص ۱۲۵

پائی جاتی ہو، ان کی وضع قطع اتنی شاندار نہیں تھی کہ لوگ دیکھتے ہی مبہوت ہو جائیں۔ ان کا چہرہ بُشرہ اتنا بارعب نہیں تھا کہ لوگوں پر ان کی ہیبت و جلال طاری ہو۔ پھر کیا بات تھی کہ ارباب دانش سے عوام الناس تک ہر شخص ان کا گرویدہ رہتا تھا۔ ان کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا؟ بات درحقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے مخلص اور دردمند انسان تھے۔ انہوں نے بڑے اخلاص و لگن کے ساتھ خدمتِ خلق اور نشر علوم میں اپنی پوری زندگی صرف کر دی انہوں نے عُسرت و تنگدستی کی زندگی گذاری۔"[1]

اس تنگدستی اور عسرت کے ہوتے ہوئے بھی وہ اس قدر غنی تھے کہ اپنی مثال آپ تھے۔ مشاہرہ کی قلت کے باوجود لگن اور محنت کا یہ حال کہ اس کو اشرفیہ کے در و دیوار ہی بتا سکتے ہیں۔ مگر اشرفیہ کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا، کچھ بھی ہو مگر اشرفیہ میں رہیں گے۔ حالانکہ ان مایوس کُن حالات میں بہت سی جگہوں سے اچھے اچھے مشاہرے پیش کئے گئے۔ پھر بھی آپ قناعت گزینی پر تکیہ کئے رہے اور کہیں جانے سے صراحۃً انکار کر دیا۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ مشاغل و انہماک میں کوئی فرق نہیں آیا۔ نہ تو کبھی حرف شکایت زبان پر لائے۔ بلکہ اپنی اسی لگن سے کام کرتے رہے اور اشرفیہ کی ترقی کیلئے شب و روز روغن جگر جلاتے رہے۔ ان کی بے لوث خدمت پر ہزار بار سلام چنانچہ ـــــــ مذکور ہے کہ

"اگر وہ چاہتے تو ہند و پاک کے کسی بڑے ادارہ میں جاکر اپنی خوشحالی کے لئے کثیر مشاہرہ حاصل کر سکتے تھے۔ وہ یہیں (اشرفیہ میں)

---

[1] ـــــــ ماہنامہ اشرفیہ جولائی، اگست ۱۹۸۵ء ص ۶ ۱۲۔

رہے، اپنے استاذ مکرم حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ کی مرضی کے خلاف کہیں جانے کا ارادہ نہیں کیا۔ نہ ہی ان کی زبان مبارک پر حرف شکایت آیا۔ وہ بڑے معاملہ فہم، دوراندیش تھے۔ ان کی معاملہ فہمی اور حسن تدبر کی وجہ سے کتنے عقدہائے لاینحل حل ہوگئے وہ طلبہ واساتذہ پر بڑے شفیق اور مہربان تھے۔ ان کی شفقت و محبت کا یہ عالم تھا کہ ہر متعلق شخص کو ان کا دل ذی علم بنانے کیلئے بے تاب رہتا تھا"[1]

کھانے اور پہنے میں اس قدر سادگی تھی کہ متبحر علماء میں ایسا کم دیکھا گیا۔ اور کیوں نہ ہو، حضور حافظ ملت کا پرتو اور عکس ان کے اوپر تھا۔ وہ تو انہیں کے ظلِ ظلیل تھے۔ پھر سادگی کیسے ترک کرسکتے تھے۔ حضرت مولانا اختر حسن صاحب اوروی فرماتے ہیں۔

"گھر والے جو کپڑا بنا کر دیدیتے وہی پہنتے کھانا جو مل جاتا وہی کھالیتے"۔
یہ کس قدر متوکلانہ زندگی ہے اور فقر و استغنا کی منہ بولتی تصویر۔

ایک دلچسپ واقعہ

ان کی سادہ زندگی لوگوں کو مغالطہ میں ڈال دیا کرتی تھی۔ لوگ بھاری بھرکم تصور لیکر آتے اور انہیں تلاش کرتے دیکھا جاتا کہ مایوس ہوکر لوٹ رہے ہیں، ہاں کسی طرف سے نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، نعرۂ رسالت یارسول اللہ، غزالی دوراں زندہ باد کا جب نعرہ لگتا تو پتہ چلتا کہ علم کی منہ بولتی تصویر نگاہوں کے سامنے ہے۔ فتاوی رضویہ کی اشاعت کے بعد سے لوگ بے پناہ متاثر تھے۔ دور افتادہ لوگ بھی علمی لوہا مان چکے تھے۔ ایک مرتبہ فتاوی رضویہ کی اشاعت کے بعد مغربی پاکستان میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی

[1] ماہنامہ اشرفیہ جولائی، اگست ۱۹۸۵ء ص ۶ ۱۲

جس میں ممالک اسلامیہ کے بہت سارے علماء مدعو کئے گئے ۔ ہندوستان سے حضرت حافظ جی علیہ الرحمہ کو مدعو کیا تھا ۔ جناب عباس انصاری (ٹکیہ باڑہ ہوڑہ) جو حضرت موصوف کے رشتہ دار ہیں ۔ بیان کرتے ہیں کہ مجھ کو یہ واقعہ حافظ جی نے سنایا تھا کہ

"جب میں لاہور اسٹیشن پر اپنی اٹیچی لیکر اترا تو دیکھا کہ اسٹیشن پر بہت سارے لوگ علماء کے استقبال کے لئے موجود ہیں ۔ میں اٹیچی لیکر نیچے اتر کر ایک طرف کھڑا ہو گیا ۔ لوگ اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کر کسی کو تلاش کر رہے تھے اور ٹرین کا ہر ڈبہ چھان مارا گیا ۔ آنے والے کا کوئی سراغ نہیں ملا ، میں اپنے لباس میں تھا ۔ اس لئے میری طرف کسی کا ذہن نہیں گیا ، لوگ بس تلاش کر رہے ہیں ۔ ایک شخص نے میری طرف توجہ کی اور پوچھا کہ آپ کہاں سے آرہے ہیں ۔ میں نے کہا کہ میں ہندوستان مبارکپور سے آرہا ہوں ۔ پھر کیا تھا لوگوں نے مجھ کو اٹھا لیا اور نعروں پر نعرہ لگاتے ہوئے لیکر کار تک گئے ۔ اور ہاروں سے مجھ کو لاد دیا گیا ۔ میں نے پوچھا میری اٹیچی کیا ہوئی ۔ تو لوگوں نے کہا کہ حضور! آپ مطمئن رہیں ۔ پھر جب قیامگاہ پر پہونچا تو اٹیچی میرے ہاتھ لگی "۔

یہ تھی وہ سادہ زندگی اور علمی وقار وجلال کہ بادی النظر میں لوگ نہیں سمجھ پاتے تھے ۔ مگر علمی معاملہ ہوتا تو بڑے بڑے فرط ادب میں جھک جاتے تھے ۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ اتنے قناعت پسند تھے کہ اشرفیہ میں جب صبح کو درس دینے آتے تھے تو صبح ناشتہ میں خشک روٹیاں کھا کر آتے ۔ مگر کبھی کسی سے تذکرہ نہیں کیا ۔ اور اس خشک روٹی پر شرح چغمینی ، تصریح ، امور عامہ اور شمس بازغہ جیسی کتابیں درس دیتے تو رازی وغزالی کی موشگافیاں آنکھوں دوڑ جاتیں

ع مرحبا اے ملت بیضا کے فرزند عظیم

وصال

۱؍ شعبان المعظم ۱۳۹۱ھ کو یک بیک درد شکم اٹھا۔ اور شدت اختیار کرتا گیا۔ ڈاکٹروں سے رجوع کرنے کے بعد مرض جاتا رہا، اور کسی حد تک صحت بھی بحال ہوگئی۔ چونکہ مزاج میں حرکت تھی اس لئے رمضان میں بھی تگ و دو سے باز نہیں آئے۔ اور خدمتِ دین متین میں پھر صبح و شام ایک کر دیا ـــــ خرابی صحت کا اثر باقی تھا، اس پر بجائے آرام کے پھر محنت، جس سے پھر ۹؍ شوال المکرم سے طبیعت بگڑنی شروع ہوگئی اور درد پھر عود کر آیا۔ مبارکپور کے ڈاکٹروں کو دکھایا گیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پھر اعظم گڈھ لے چلنے کی بات ہوئی۔ جمعہ کا دن ہے اعظم گڈھ لے چلنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں، مگر قدرت کے نوشتۂ ازلی کو کون جانتا تھا کہ احباب جس سفر کی تیاری میں لگے ہیں مسافر کو اس سفر کے علاوہ ایک ایسے سفر پر جانا ہے جس کی حدیں ملکوتیت کے دائرے سے ملتی ہیں۔ چنانچہ اِدھر اعظم گڈھ لیجا کر مشن اسپتال میں ایڈمٹ کیا گیا، اُدھر شہر اعظم گڈھ کی دھرتی پر زندگی کا تھکا ہارا مسافر اپنی منزل مقصود تک پہنچا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ـــــ ۱۴؍ شوال المکرم ۱۳۹۱ھ مطابق ۱۹۷۱ء بروز جمعہ لگ بھگ گیارہ بجے دن میں حضرت علامہ رب کے جلوؤں میں گم ہوگئے، وقت کا المیہ دیکھئے کہ میخانۂ علم کا ساقی میکدہ عرفان کے میکشوں کو چھوڑ کر روٹھ چکا ہے اور تشنہ لب آہ، آہ کی کرب انگیز صدائیں بلند کرتے ہوئے اپنے اپنے کاسۂ علم کو حسرت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ آنکھوں کا خمار اتر چکا ہے۔ نگاہیں ویران ہوتی جا رہی ہیں۔ دار العلوم مصباح العلوم کے در و دیوار پر حسرت و یاس برس رہی ہے۔ ساقی تیری نوازش کا بے پایاں شکریہ،

پھر کہاں جا کے کریں دست تمنا کو دراز
عقل میں کچھ نہیں آتا کہ کہاں رکھیں قدم! (قمر بستوی)

جب حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کو سانحۂ ارتحال کی خبر جانگداز پہنچی تو کلمۂ استرجاع پڑھا اور ان کے اوپر سکتہ طاری ہو گیا۔ نگاہوں سے کرب کے آثار جھلک رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی عظیم دولت کھو چکی ہو۔ اور بدن کی ساری طاقت کھنچ گئی ہو۔ آپ یک بیک ضعیف معلوم ہونے لگے۔ اور ڈوبی آواز میں تجہیز و تکفین کا حکم صادر فرمایا۔ تجہیز و تکفین کا حکم مل جانے پر انتظامات شروع ہوئے۔ نماز جمعہ کے بعد تعزیت کرنے والوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ جو رات کے تقریباً ۹ بجے تک چلتا رہا۔ پھر جنازہ کو غسل دیا گیا اور تکفین کے بعد جنازہ قبرستان کی جانب لے جایا جانے گا۔ اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کسی فردِ واحد کا جنازہ نہیں، علم و فن کی ایک انجمن بلکہ پوری قوم کا جنازہ ہے ——— علم و حکمت کے جنازے کو لوگ بڑھ بڑھ کر کاندھا دینے کی سعادت حاصل کر رہے تھے۔ اور اپنے محسن کی آخری خدمات میں ہر شخص پیش پیش ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

لوگوں کا بیان ہے کہ حضرت کے جنازے میں غیر معمولی مجمع تھا، تقریباً ۲۸ لمبی صفیں تھیں جبکہ مبارکپور کی دھرتی پر اس سے قبل اتنا بڑا مجمع کسی بھی جنازے میں نہیں دیکھا گیا۔ حضرت بحر العلوم صاحب قبلہ نے ان کی وفات حسرت آیات کا ذکر کچھ ان لفظوں میں فرمایا ہے۔

۱۴ / شوال ۱۳۹۱ھ کو جمعہ کے روز لگ بھگ ۱۱ بجے مولانا عبدالرؤف صاحب نائب شیخ الحدیث دارالعلوم اشرفیہ ایک مختصر سی علالت کے بعد اعظم گڈھ مشن ہسپتال میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دن گذار کر رات میں ۹، ۱۰ بجے کے درمیان آپ کی نماز جنازہ ہوئی۔ حاضرین کی تعداد کے لحاظ سے یہ ایک غیر معمولی نماز جنازہ تھی۔ کچھ کم و بیش ۲۸ صفیں وہ بھی اتنی رات گئے۔ جامع مسجد کی نماز کے علاوہ یہاں

دیکھنے میں نہیں آئی........... بات اصل یہ ہے کہ مولانا
ایک فرض شناس اور محبت کرنے والے صاحب اہل وعیال آدمی
تھے۔ پورے درس نظامیہ پر اعلیٰ درجہ کا استحضار رکھنے والے
ایک غیر معمولی مدرس تھے۔ عبقری صفت فقیہ تھے۔ ہند و پاکستان
میں چوٹی کے علمائے اہلسنت میں شمار ہوتے تھے۔ اور ان سب سے
سے بڑھ کر ایک مسلّم قانت، ایک انسان کامل اور ایک خاص بندۂ
خدا تھے۔ اس لئے ان کی وفات پر پورے معاشرے کا اضطراب،
اور ایک وسیع خطہ زمین میں اس سانحہ کا سوگ منایا جانا ایک فطری
امر تھا۔ اسی لئے اہل وعیال، عزیز واقربار، حلقۂ احباب اور عام
متعلقین، علما، و مدرسین، طلبہ و معتقدین کے ساتھ ساتھ مختلف ادارے
اور انجمنیں جیسے انجمن اہلسنت واشرفی دار المطالعہ، دار العلوم اشرفیہ
اور ہندوستان کے بیشمار مدارس اور تنظیموں نے اس سانحہ پر
اپنے دلی دکھ کا اظہار کیا۔ اور ایصال ثواب کی مجلسیں قائم کیں۔
لیکن ان تمام سوگواروں کی بھیڑ میں ایک اور ادارہ بھی تھا جو کچھ نہ
کر سکا۔ حالانکہ مولانا اس کے سب کچھ تھے اور وہ مولانا کا سب کچھ،
میری مراد سنّی دار الاشاعت مبارکپور اعظم گڈھ سے ہے۔ وجہ اس کی
یہ ہوئی کہ اور جن جن سے مولانا کا تعلق تھا ادارہ ہو کہ انجمنیں مدرسہ ہو
کہ شخصیتیں ان کا علیحدہ اپنا وجود بھی تھا اور سنّی دار الاشاعت کو مولانا
سے الگ کر کے سوچا ہی نہیں جا سکتا۔ اس لئے مولانا کے بعد سنّی
دار الاشاعت خود بھی مر گیا۔ کون رہ گیا تھا جو اس کی طرف سے مولانا
کا سوگ مناتا۔ سب اپنی اپنی طرف سے ہی مولانا کے غم میں مبتلا تھے۔
اور جہاں سے مولانا کے لئے سب کچھ ہونا چاہئے تھا۔ وہاں سنّاٹا

تھا، کون کرتا؟ مولانا ہوتے تو بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ پر اب تو وہ خود ہی
کفن اوڑھ کے سو گئے تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر آپنے کہ سانجھ بھئی چو دیس

آپ اسی بات کو حیرت سے نہ سنیں، واقعہ یہی ہے کہ مولانا عبدالرؤف
صاحب سنّی دارالاشاعت کی اسکیم بنانے والے تنہا تھے، اس کا چندہ وصول کرنے
والے وہی پیش پیش، بریلی شریف سے فتاویٰ کا مسودہ وہی لائے، مبیضہ
انہوں نے کرایا، دونوں کا مقابلہ حرف بحرف انہوں نے ہی کیا، پریس والوں
سے معاملہ انہیں کا کام تھا، کاپی، پروف، فہرست، عنوان کی تیاری بار بار لکھنؤ
جانا، حتیٰ کہ کتاب بھی خود ہی لانا، اور یہاں طالب علموں کے ساتھ مل کر بنڈل
ڈھونا، کس کس بات کو یاد کیا جائے۔ کتاب چھپ گئی تو لوگوں کو خطوط لکھنا،
آرڈر بک کرنا، ان کے لئے پارسل سینا، اس کو بھیجنا کون سا کام تھا جو تنہا مولانا
نے نہ کیا ہو، اور اس خاموشی اور بے نیازی سے کہ نہ صلے کی خواہش نہ داد کی
پرواہ، مرنے والے کی ایک ایک ادا یاد کر کر خون کے آنسو رلاتی ہے اور کیوں
نہ ہو؟ ؎

جان کر منجملہ یہ خاصان مےخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

مگر دنیا کا یہ حال ہے کہ

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی،
ہزاروں اٹھ گئے پھر بھی وہی رونق ہے محفل کی

مولانا عبدالرؤف صاحب بھی اٹھ گئے۔ اقربا نے رو دھو کر صبر کر لیا
دوست احباب، متعلقین وہم جنس فاتحہ خیر سے فرصت و فراغ پا کر

اپنے اپنے مشغلوں میں مصروف ہو گئے۔ حد یہ کہ دارالعلوم اشرفیہ مولانا جس کے لئے ریڑھ کی ہڈی تھے۔ مولانا کی خالی جگہ کی پرواہ کئے بغیر برابر آگے بڑھتا رہا۔ لیکن ایک سنی دارالاشاعت کی بے گور وکفن لاش البتہ پڑی رہی ـــــــ ان کے جسم کو لوگوں نے دفن کر دیا لیکن یہ ادارہ جو ان کی روحانیت کا روپ تھا اس کی طرف توجہ نہ ہو سکی حالانکہ یہ وہ ادارہ تھا جس کے لئے مولانا نے خود کو فنا کر دیا تھا ـــ آخر اسی کو خیال آیا جو زندگی میں بھی مولانا کا سب سے قریب تھا۔ انکے جسم و جان بلکہ دین وایمان کے بعد سارے جہاں سے قریب یعنے آقائے نعمت حضور حافظ ملت دام بالفضل والایادی آپ نے مولانا محمد شفیع صاحب اور مولانا قاری محمد یحییٰ صاحب کو اس کام پر مامور فرمادیا۔ اوران لوگوں نے حساب وکتاب کر کے گاڑی کو ایک رخ پر لگا دیا[1]

بھوجپور (بلیا) میں طلوع ہونے والا علم وفضل کا یہ نیّر تاباں اپنی زندگی کے خط استوا پر چمکتا دمکتا ۵۹ سال کا عرصہ پورا کر کے مبارکپور کی علم وآگہی کی سر زمین میں غروب ہو گیا۔ مگر ایک عالم کو اپنی حکمت وتدبر کی ضیاؤں سے منوّر کر گیا۔

فنا کے بعد بھی باقی ہے شان رہبری تیری
ہزاروں رحمتیں ہوں اے امیر کارواں تجھ پر

ابر رحمت تیرے مرقد پر گہر باری کرے
حشر تک شان کریمی ناز برداری کرے

حضرت حافظ ملت علیہ الرحمہ کے وصال فرما جانے سے دنیائے سنیت میں جو خلا واقع ہوا، وہ آج تک پُر نہیں ہو سکا۔ ایسی ہستیاں بار بار پیدا نہیں ہوتیں۔ چنانچہ وصال کے بعد سے تعزیتی خطوط کا جو سلسلہ شروع ہوا تو لگتا تھا کہ

[1] ـــــ فتاویٰ رضویہ جلد پنجم ص ۲۰۱ ـــــ ۱۲

بند ہونے کو نہیں۔ یہ ان کی محبوبیت اور مقبولِ انام ہونے کی بیّن دلیل ہے، کہ اپنے پرائے، علماء دانشور، طلبہ اور عامۃ الناس سبھی آپ سے کتنے مانوس تھے۔ اور آپ سے لوگوں کی کتنی دل بستگی تھی۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے، جب خداوند قدوس کسی کو محبوب بنالیتا ہے۔ چنانچہ عرس چہلم کے موقعہ پر حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان نے حضرت موصوف مرحوم کے متعلق ارشاد فرمایا کہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ جب کسی بندے کو مقبول فرماتا ہے تو آسمان والوں میں یہ اعلان فردیتا ہے کہ اے فرشتو! میں نے فلاں بندے کو اپنا محبوب بنالیا تم بھی اسے محبوب رکھو اور اہل زمین کے دلوں میں اس مقبول بندے کی عظمت ڈال دی جاتی ہے" [1]

انتقال فرمانے کے بعد تعزیت کا یہ سلسلہ اور تعزیتی خطوط کی بھرمار، اور ملک و بیرون ملک میں فاتحہ و قرآن خوانی اور جلسہ ہائے تعزیت، یہ سب اس بات کی بیّن دلیل ہیں کہ حضرت علامہ موصوف علیہ الرحمہ مقبول بارگاہِ خداوندی ہیں۔

•

زندہ باد اے منبعِ انوارِ علم مصطفےٰ
مظہرِ حضرت غزالی رازی و احمد رضا (قمر بستوی)

اساتذۂ کرام

(۱) استاذ العلماء، جلالۃ العلم حافظ الملۃ والدین الشیخ الشاہ عبد العزیز محدث مرادآبادی علیہ الرحمۃ والرضوان ——

بانی الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور، اعظم گڈھ۔

(۲) شیخ العلماء، جامع معقول و منقول حضرت علامہ مولانا شاہ غلام جیلانی صاحب قبلہ اعظمی سابق شیخ الحدیث دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف۔

[1] —— حافظ ملت نمبر ۵۵ —— ۱۲

③ جامع کمالات حضرت مولانا حکمت اللہ صاحب امروہوی مدرس مدرسہ حنفیہ محلّہ گذری، امروہہ۔

④ عالم نبیل، فاضل جلیل حضرت مولانا خلیل احمد صاحب صدر المدرسین مدرسہ حنفیہ محلّہ گذری، امروہہ۔

⑤ عالم ذی شان، صاحب حکمت وبیان حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب بھاگلپوری۔

⑥ صاحب فضل وکمال حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب، مئو ناتھ بھنجن

ارشد تلامذہ یوں تو حضرت علامہ موصوف علیہ الرحمہ کے تلامذہ کی ایک لمبی فہرست ہے۔ جس کو شمار کرانے کے لئے ایک علیحدہ دفتر درکار ہے۔ تاہم چند نام درج ذیل ہیں۔ آپ کے تلامذہ میں سے ایک سے ایک آسمانِ علم وفضل کے نیّرِ تاباں اور ماہ درخشاں ہیں۔ کوئی فن تدریس کا شہسوار، تو کوئی میدانِ خطابت کا شہنشاہ، کوئی قلم کا دھنی، کوئی مناظرہ کا بادشاہ۔ — الغرض سیاسیات وسماجیات، خطابت وتدریس، بحث ومناظرہ، انتظامی امور ہر میدان کے نمائندے نظر آتے ہیں۔ کسی کہنے والے نے خوب کہا ہے۔ ع

جیسا استاذ ہے ویسے ہی شاگرد بھی۔ — چند ناموں کی ایک بے ترتیب فہرست پیش ہے۔

مولانا سید محمد مدنی صاحب کچھوچھوی —— مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی —— مولانا کاظم علی صاحب بستوی —— مولانا مفتی شبیر حسن صاحب رضوی بستوی —— مولانا صوفی نظام الدین صاحب بستوی —— مولانا سخاوت علی صاحب بستوی —— مولانا بدر الدین صاحب رضوی گورکھپوری —— مولانا محمد حنیف صاحب قادری —— مولانا انور علی صاحب بستوی —— مولانا توکل حسین صاحب حشمتی —— مولانا نعیم اللہ صاحب بستوی —— مولانا مفتی عبید الرحمٰن صاحب رشیدی — علامہ ضیاء المصطفیٰ صاحب قادری ——

مولانا سعید حسن صاحب بستوی ـــــ مولانا نثار المصطفیٰ صاحب مجدی ـــــ مولانا یٰسین اختر صاحب مصباحی اعظمی ـــــ مولانا اسرار احمد صاحب گجھڑوی ـ مولانا حافظ عبد الشکور صاحب گیاوی ـــــ مولانا اعجاز احمد صاحب مبارکپوری ـــــ مولانا مفتی حبیب الدین صاحب بہاری ـــــ مولانا اختر حسین صاحب دربھنگوی ـــــ مولانا سلیم اختر پورنوی ـــــ مولانا ابو اللیث اعظمی ـــــ مولانا انور علی بستوی مفتی کرناٹک ـــــ مولانا محمد حنیف مبارکپوری ـــــ مولانا ممتاز احمد مبارکپوری اشرف القادری ـــــ مولانا محمد عبد المبین نعمانی ـــــ مولانا محمد احمد مصباحی ـــــ مولانا رحیم اللہ بلیاوی مرحوم ـــــ مولانا محمد نعمان صاحب اعظمی ـــــ مولانا قمر الزماں اعظمی ـــــ مولانا بدر القادری مصباحی ـــــ مولانا محمد ادریس صاحب بستوی ـــــ مولانا محمد اسلم صاحب بستوی ـــــ مولانا محمد اسلم صاحب گورکھپوری ـــــ مولانا نصیر الدین صاحب پلاموی ـــــ مولانا قاری اسلام اللہ صاحب اعظمی ـــــ مولانا سید محمد حسینی صاحب رائچوری (کرناٹک) ـــــ ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی ـــــ مولانا مفتی عبد الستار صاحب پورلیاوی ـــــ مولانا جمیل احمد صاحب گیاوی ـــــ مولانا سید کاظم پاشا قادری (حیدرآباد) ـــــ مولانا قاری جمال احمد صاحب اعظمی ـ

ارشاداتِ عالیہ

آپ کے ارشادات کو اگر جمع کیا گیا ہوتا تو ایک دفتر بنتا۔ مگر حیاتِ مبارکہ میں اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ حالانکہ آپ کے فرمودات وارشادات فکر ونظر کے گہرہائے گراں مایہ تھے۔ چند ارشادات ملاحظہ ہوں، فرمایا کہ

استاذ پر لازم ہے کہ وہ کامل مطالعہ کے ساتھ درسگاہ میں حاضر ہو اور اس کے ذہن میں یہ وسوسہ نہ آئے کہ معمولی کتابیں پڑھانے جارہا ہوں، اس کے مطالعہ کی کیا ضرورت اس میں مجھے بڑی

مہارت حاصل ہے ۔ کیونکہ یہ فریب نفس ہے ۔ اس سے وہ دھوکہ میں پڑتا ہے ۔ مطالعہ کے ساتھ پڑھانے میں جو بصیرت حاصل ہوتی ہے وہ بغیر مطالعہ کے حاصل نہیں ہو سکتی ۔ کتاب کو معمولی اور ابتدائی تصور کر کے اس سے صرفِ نظر کرنا یہ طلبہ کے ساتھ ایک قسم کی بدسلوکی ہے جو کسی طرح بھی روا نہیں رکھی جا سکتی ۔ مطالعہ سے علم میں اضافہ ہوتا ہے ۔ خواہ کتاب ابتدائی معمولی ہی کیوں نہ ہو"[1]

آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ

"پڑھانے کے لئے یہی ضروری نہیں کہ کتاب از بر مضمون پر کامل عبور ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ استاد اپنے طریقۂ تعلیم پر مسلسل غور و فکر جاری رکھے ۔ کیونکہ کلاسوں میں ہر طرح کے طلبا ہوتے ہیں کوئی ذکی و زود فہم ہوتا ہے وہ بڑی آسانی کے ساتھ کسی مسئلہ کو سمجھ لیتا ہے کوئی بطی الفہم دیر میں سمجھنے والا ہوتا ہے ۔ استاذ کی ذمہ داری ہے کہ دیر میں سمجھنے والے طالب علم کا بھی خیال رکھے ۔ اور اس کو تمثیل کے ذریعہ یا آسان اسلوبِ بیان سے کتاب فہمی میں مدد دے ۔ کمال یہ نہیں کہ ذکی طلبہ کو آسانی کے ساتھ زیر بحث مسئلہ کا ادراک کرا دے بلکہ خوبی کی بات یہ ہے کہ کم فہم بچوں کی صلاحیت کا خیال کر کے اپنے اسلوبِ بیان کو بدلتا رہے"[2]

تلامذہ اس کی طرف توجہ دیں تو اب بھی بہت سارے ارشادات جو یاد داشت کے نہاں خانوں میں موجود ہیں ۔ قلمبند ہو کر صفحاتِ قرطاس کی زینت بن سکتے ہیں ۔

[1] ماہنامہ اشرفیہ جولائی ، اگست ۱۹۸۵ء ص ۶ [2] ماہنامہ اشرفیہ جولائی ، اگست ۱۹۸۵ء ص ۶

تأثرات

استاذ العلماء جلالۃ العلم حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان

میں نے خدمتِ دین کے ایک بڑے فریضہ کا بوجھ اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھایا، اور عربی یونیورسٹی کی تاسیس و قیام کا ایک جامع منصوبہ عمل میں آیا۔ اور اس سلسلے کی تمام کوششوں، کاوشوں میں ہمہ وقت مصروف رہنے والے مولانا عبدالرؤف صاحب ہی تھے۔ بلکہ جامعہ کا خاکہ انہیں کا تیار کیا ہوا تھا۔ گوکہ ان کے مصاجبین اور رفقائے کار نے اس بارے میں انکی بڑی مدد فرمائی تاہم انہیں خطوط پر عملی اقدام ہونے والے تھے۔ اب جبکہ ان کے خاکے مطابق عمل و پیش قدمی کا وقت آیا تو وہ اچانک اس دارفانی سے رحلت کرگئے وہ میرے لئے دست و بازو تھے۔ ان کے انتقال کے بعد میں بہت مایوسی کا شکار رہا۔ الخ۔

(ماہنامہ اشرفیہ جولائی اگست ۱۹۸۵ء ص ۵ و ۴)

شمس العلماء حضرت علامہ قاضی شمس الدین جعفری صدر المدرسین جامعہ حمیدیہ بنارس

"آج ہندوستان سے کتاب کا سمجھنے والا چلا گیا"

(ماہنامہ اشرفیہ حافظ ملت نمبر، ص ۵۴۳)

علامہ ارشد القادری مہتمم جامعہ فیض العلوم جمشید پور بہار

حضرت علامہ حافظ عبدالرؤف صاحب قبلہ علیہ الرحمۃ والرضوان علم وحکمت، فضل وتقویٰ، اخلاص وایثار اور مودت وشفقت کی ایک خاموش تصویر تھے۔ طلبہ سے لیکر اساتذہ تک، اراکین سے لیکر علماء تک اپنے معاصر اور اکابر ہر صف میں ان کی شخصیت اتنی دل آویز تھی کہ مجھے ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا جو انکی طرف سے شاکی ہو۔ حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان نے انہیں اپنی زندگی میں اپنا مایہ ناز جانشین بنایا تھا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ ان کے انتقال کی خبر سے حافظ ملت پر بڑھاپا طاری ہوگیا ــــ (مکتوب مورخہ ۱۹ر فروری ۱۹۸۵ء)

علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی صدر شعبۂ افتاء الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور

حضرت علامہ حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ کیا تھے؟ یہ جاننے کے لئے کافی ہے کہ حضرت حافظ ملت علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ مولانا عبدالرؤف صاحب نے مجھ سے پڑھا ضرور ہے مگر مجھ سے زیادہ قابل ہیں۔ میں پورے ایقان و اذعان کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا عبدالرؤف صاحب حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے علم وفضل، تدریس وتنظیم، تربیت وتدبیر کے صحیح معنی میں وارث تھے، صرف یہی نہیں کہ وہ صرف حضور حافظ ملت قدس سرہ کے وارث تھے۔ بلکہ حقیقی معنوں میں بقیۃ السلف اور حجۃ الخلف تھے۔ (مکتوب ۱۶ر صفر ۱۴۰۷ھ)

مولانا محمد کاظم علی صاحب عزیزی شیخ الحدیث تدریس الاسلام بسڈیلہ بستی

موصوف کی دینی خدمات کا ہر پہلو اہم اور ہر ساعت انوکھی اور ہر ادا بے مثال

تھی۔ طلبہ پر شفقت، اور افہام وتفہیم کا طرز تو زمانے سے نرالا تھا حضرت کے بعد صرف درسگاہیں سونی نہیں ہوئیں بلکہ مدرسین یتیم ہو گئے۔
(مکتوب ۱۳/ فروری ۱۹۸۵ء)

مولانا مفتی شبیر حسن صاحب بستوی شیخ الحدیث الجامعۃ الاسلامیہ رونا ہی

حضور استاذ گرامی علامۂ زماں، محقق دوراں، امام وقت حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ ماہر فتاوی رضویہ، جو منطق وفلسفہ کے امام اور ارسطوئے وقت تھے، اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ علوم عقلیہ ونقلیہ پر دسترس تامہ تھی۔ بعض علوم جدیدہ کے بھی ماہر تھے۔ جزئیات نوک زبان، افہام وتفہیم کا وہ ملکۂ راسخہ جو نادر الوقوع دیکھا۔ اعلیٰ وادنیٰ ہر ذہن کا طالب علم درسگاہ سے مطمئن ہو کر اٹھتا زہد وتقویٰ میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ مجمع البحرین سے اگر آپ کو تعبیر کیا جائے تو بجا ـــــــ

مولانا حافظ عبدالشکور صاحب استاذ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارکپور

تدریس کی امتیازی خصوصیت کے ساتھ دینداری سنجیدگی، معاملہ فہمی اور دوراندیشی میں بھی آپ کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ حافظ ملت کی بارگاہ میں بیشتر آپ کی رائے کی ترجیح وتائید ہوتی۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں، لیکن اہل بصیرت جگہ جگہ ان کی عظمتوں کے نشان اور علمی جلوے بصورت تلامذہ دیکھ سکتے ہیں ـــــــ (مکتوب ۱۶/ اکتوبر ۱۹۸۶ء)

مولانا یٰسین اختر صاحب، سابق استاذ ادب الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور

علمائے اہلسنت کے درمیان حافظ جی علیہ الرحمہ اپنے علم وفضل، زہد وتقویٰ صبر وقناعت، سادگی وبے نفسی اور تواضع وخاکساری میں لمتاز حیثیت کے مالک تھے۔ فرزندانِ اشرفیہ کے دل آپ کی عقیدت واحترام سے ہمیشہ لبریز رہے، اور رہیں۔ آپ کا انداز درس آج بھی ان کے ذہن ودماغ پر نقش ہے۔ دقیق علمی مسائل کو عام فہم بنانا آپ کا ادنیٰ وصف تھا مشکل ترین انتظامی امور ومعاملات کو حل کرنا آپ کا معمول تھا۔ اور ہر نازک موڑ پر اساتذہ وطلبہ کی نگاہیں آپ ہی کی طرف اٹھا کرتی تھیں۔ بڑوں کی تعظیم وتوقیر اور چھوٹوں پر شفقت ومہربانی کے لحاظ سے بھی آپ کی ذات اپنی مثال آپ تھی۔ حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان سے آپ کو والہانہ لگاؤ تھا۔ اور حافظ ملت بھی آپ کو بے پناہ چاہتے اور آپ کی قدر کیا کرتے تھے۔ جامعہ اشرفیہ (مجوزہ عربی یونیورسٹی) مبارکپور کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی فضا ہموار کرنے میں آپ نے کلیدی رول ادا کیا۔ اور جامعہ کی شب وروز خدمت میں ایسے مصروف ہوئے کہ اسی کی راہ میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت ایں عاشقانِ پاک طینت را

(مکتوب مورخہ ۴؍ جون ۱۹۸۶ء)

مولانا محمد عبد المبین نعمانی صاحب مدیر ماہنامہ اشرفیہ وصدر المدرسین دار العلوم قادریہ

ماہر علوم حضرت علامہ مفتی عبد الرؤف صاحب بلیاوی نائب حافظ ملت حضور استاذ العلماء شیخ الحدیث دار العلوم اشرفیہ مبارکپور علیہما الرحمۃ والرضوان

ایک زبردست عالم تھے۔ اور علوم وفنون متداولہ میں مہارت تامہ کے حامل، بعض نادر علوم میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ مثلاً علم ہیئت ونجوم اور توقیت ولوگارثم وغیرہ ——— حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کو اپنے تلامذہ میں آپ پر جس قدر ناز تھا کسی پر نہ تھا۔ حضرت فرماتے تھے ——— "مولانا عبدالرؤف صاحب نے مجھ سے پڑھا ہے مگر علم میں مجھ سے آگے ہیں"۔ اس سے جہاں حضرت حافظ جی قبلہ کی عظمت کا پتہ چلتا ہے، وہاں حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ کے کمال تواضع اور جذبہ حوصلہ افزائی کا بھی اندازہ لگتا ہے۔ حضرت حافظ جی علیہ الرحمۃ سارے مروجہ علوم وفنون میں کامل مہارت اور اپنے اقران پر فوقیت کے باوجود اس قدر سادہ اور منکسرانہ زندگی گذارتے تھے کہ نئے آدمی کو اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا کہ آپ کوئی عالم ہیں۔ علم ظاہر کے کوہ گراں ہونے کے ساتھ ساتھ فقر وعرفان اور غنائے نفس کے بھی آپ ایک ایسے عظیم پیکر تھے جس کی مثال آج بہت مشکل سے ملے گی۔ حب جاہ، حرص مال، اور شہرت وناموری کی خواہش سے یکسر پاک تھے۔ تدریس کا انداز نہایت میٹھا تھا اکثر متبسم رہتے اور اس انداز سے پڑھاتے اور پوچھتے جیسے کوئی شفیق باپ اپنے چھوٹے اور کم سمجھ بچوں سے گفتگو اور سوال کرتا ہے۔ درسیات کی مشکل سے مشکل عبارت آپ نہایت آسانی سے حل فرما دیتے ——— مولائے غافر وقدیر آپ کے مرقد کو اپنی رحمت ونور سے بھر دے۔ اور ہم پسماندگان کو ان کے نقوش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے ——— آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ——— (مکتوب ۲۹/ جنوری ۱۹۸۷ء)

ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم بستوی (پی ایچ ڈی) علی گڈھ مسلم یونیورسٹی

یوں تو ہندوستان کی عظیم درسگاہ دارالعلوم اشرفیہ کی مسند تدریس کو ۱۳۵۲ھ سے نہ جانے کتنے لوگوں نے زینت بخشی۔ مگر شہنشاہ درس و تدریس حضرت علامہ حافظ عبدالرؤف صاحب قبلہ علیہ الرحمہ (متوفی ۱۹۷۱ء) کی کچھ اور ہی بات تھی۔ علوم نقلیہ کے علاوہ علوم عقلیہ میں وہ یگانۂ روزگار تھے۔ عمر نے وفا کی ہوتی تو شاید اس دور میں معقولاتی علماء کے درمیان تجرباتی علوم میں وہ اپنی مثال آپ ہوتے۔ کلکتہ کے سفر میں میں نے ایک بزرگ سے سُنا کہ حافظ جی علیہ الرحمہ فرماتے تھے، کہ "اگر حکومت آلات فراہم کرے تو علماء ایجادات میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے"۔ ظاہر ہے کہ اس قول میں صداقت کے علاوہ حافظ جی کی زندگی کے پورے خط و خال نظر آرہے ہیں۔ اور واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ حافظ جی کیا تھے۔ تجرباتی علوم میں انہیں کتنی دسترس تھی اور اس فن میں وہ کیسے عزائم رکھتے تھے۔ اپنے اساتذہ سے میں نے ان کی خوبیوں کے بارے میں کیا اور کتنا سُنا، اس کی تفصیل کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔ یہاں بات صرف اتنی ہے کہ جس طرح وہ اپنے فن میں یگانۂ روزگار تھے، اس طرح انہیں مسند بقا کے دوام پر بار نہیں مل سکا۔ (مکتوب ۲۹ جنوری ۱۹۸۷ء)

انگلش سے ترجمہ:

ماسٹر آفتاب احمد خاں صاحب انگلش ٹیچر الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور

"اسلام کا عظیم معلّم" وہ ایک سادہ رہن سہن اور عمیق مطالعہ کی علامت تھے وہ ظاہری طور پر سلف صالحین کے حقیقی مطیع تھے۔ وہ دُبلے اور کمزور لیکن مصروف الذہن تھے۔ وہ آہنی عزم کے مالک تھے۔ وہ اسلام کے عظیم مفکر اور معلّم تھے۔ وہ حدیث تفسیر فقہ، فلسفہ، منطق اور ہیئت پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے شریعت محمدیہ (صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم) کے اساتذہ کی ایک فوج تیار کی۔ ان کی تدریس اور گفتگو میں ایک تبلیغ ہوتی تھی۔ ان کے پڑھانے کا اسلوب بہت سادہ اور جاذب تھا۔ مسائل شرعیہ

ان کے ذریعہ بہت آسانی اور عمدگی سے حل ہو جاتے تھے ــــــ ایک مرتبہ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ (بانی الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور) نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ مولینا عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ اپنے وقت کے قطب تھے۔ وہ حافظ ملت کا داہنا بازو تھے۔ وہ ان پر (حضرت مولانا عبدالرؤف علیہ الرحمہ) ناز فرماتے تھے۔ تاحین حیات وہ اپنی ڈیوٹی کے پابند رہے۔ ان کا مسکراتا چہرہ ہر شخص کے لیۓ جاذب تھا۔ ان کی فکر معیاری اور الفاظ چیدہ ہوتے تھے۔ علوم اسلامیہ کے بڑے علماء بھاری تعداد میں شریعتِ اسلامیہ کے پیچیدہ مسئلوں کے حل کے لۓ ان کے گھر اور دارالعلوم اشرفیہ تشریف لاتے تھے۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ وہ اسٹیج کے مقرر نہیں تھے۔ لیکن شریعتِ محمدیہ (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کے میدان میں انہوں نے اعلیٰ درجہ کے مقررین پیدا کۓ ــــ وہ اپنے بیشتر اوقات مطالعہ اور حصول علم کے لۓ صرف کرتے تھے۔ ان کی قوت حافظہ بہت تیز تھی۔ وہ شریعت کے مشکل مسئلوں کو حل کرنے میں بہت کم وقت لگاتے تھے اور تفہیم کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیا کرتے تھے۔ ان کا کھانا بہت معمولی ہوتا تھا۔ بیماری کے سبب وہ کمزور سے کمزور ہوتے چلے گۓ۔ لیکن انہوں نے کبھی بھی اپنی تدریس اور مطالعہ کا سلسلہ نہیں چھوڑا۔

(انگلش سے ترجمہ:

جناب محمد عرفان خاں صاحب بی اے، ایل ایل بی (علیگ) اَدری ضلع مئو

میں احسان کے قرض سے اس وقت تک سبکدوش نہ ہوں گا جب تک کہ حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ کی گراں قدر خدمات کا اعتراف اور اپنی گہری عقیدت کا اظہار تحریر میں نہ کرلوں۔ اُفقِ علم پر توسیع اور پھیلاؤ کے لۓ آپ کی دین واضح ہے۔ آپ علوم عقلیہ اور نقلیہ کے بڑے عالم تھے۔ منطق وفلسفہ میں آپ کو عبور حاصل تھا۔

اس "عظیم درویش" کی نظر فقہ اور تفہیم میں بہت گہری تھی ۔ حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ کی ان کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو انہوں نے فتاوی رضویہ کی اشاعت میں کیا تھا ۔ تعلیمی میدان میں آپ کا کارنامہ یاد کے لائق ہے ۔ انسانیت سے متعلق آپ کا زاویۂ نظر آپ کی منفرد صفت تھی ۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آپ کمزور، اور کچلی ہوئی انسانیت کے لیے مسیحا تھے ۔

آپ سادہ، سنجیدہ اور متوازن مزاج رکھتے تھے ۔ اپنی گفتار سے ہمیشہ لوگوں کو صرف متأثر کیا بلکہ انہیں قائل کرنے کا سلیقہ ان میں بدرجۂ اتم تھا ۔ اخیر میں اس بزرگ ہستی کو اپنی جانب سے نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہوں ۔

حضرت مولانا حافظ عبد الرؤف علیہ الرحمہ

اور سنی دار الاشاعت

از: مولانا محمد احمد مصباحی استاذ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور،

باسمہٖ وحمدہٖ والصلوٰۃ علیٰ نبیہٖ وجنودہٖ

جامع معقول ومنقول علامہ حافظ عبد الرؤف بلیاوی ثم مبارکپوری علیہ الرحمہ گوناگوں خوبیوں کے مالک اور مختلف علوم وفنون کے ماہر تھے۔ ان کے فضائل وکمالات کی تصدیق کے لئے سب سے نمایاں اور تشفی بخش ثبوت یہ ہے کہ ان کی علمی وفنی مہارت کا چرچا صرف ان کے تلامذہ کی زبانوں پر نہیں بلکہ ان کے اساتذہ اور ان کے وہ اکابر جن سے موصوف کو رشتہ تلمذ بھی نہیں۔ اور ان کے معاصرین (جبکہ معاصر اپنے معاصر کے کمال کا اعتراف بآسانی نہیں کرتا) سب کے سب ان کے زمانہ حیات ہی سے ان کی علمی برتری، فنی مہارت، تدریسی کمال، انتظامی وتعمیری فکر وتدبر، اور قومی وملی دل سوزی ومحنت کا برملا ذکر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انہیں جاننے پہچاننے والے کم تھے۔ اس لئے کہ ان کی زندگی پر سادگی، کم گوئی، جلسوں اور تقریروں سے کنارہ کشی اور نمود وریا کے ہر دلکش موقع سے دوری کی دبیز چادر پڑی ہوئی تھی۔ اس لئے ان کو سمجھنا ان عوام اور کم سواد علماء کے بس کی تو بات ہی نہ تھی جن کے نزدیک ظاہر کی دلکشی ہی سب کچھ ہے۔

مجھے ان کی شخصیت سے سب سے زیادہ جس چیز نے متأثر کیا وہ باں فضل وکمال ان کی یہی سادگی وبے نفسی ہے۔ اور بھی چند باتیں ہیں جن سے میں بہت متأثر ہوں، ان ہی امور کا تذکرہ یہاں مقصود ہے۔

(۱) وہ دار العلوم اشرفیہ میں نائب شیخ الحدیث تھے۔ صدارت حافظ ملت علیہ الرحمہ

کی تھی۔ لیکن تعلیمی نظم ونسق زیادہ تر حضرت حافظ جی[1] علیہ الرحمہ سے ہی متعلق تھا۔ اس خصوص میں ان کا کمال یہ تھا کہ طلبہ کے معاملات تو فیصل کرتے ہی تھے مگر مدرسین کے درمیان بھی کوئی اختلاف، شکر رنجی، اور بدمزگی نہ پیدا ہونے دیتے۔ جہاں چند ہم پایہ اساتذہ ہوں کچھ باہمی اختلاف ورنجش بعید نہیں۔ لیکن کم از کم اتنا میں پورے دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ کی حیات تک اساتذہ کا کوئی اختلاف طلبہ کی نظروں تک نہ آسکا ——— اور گروپ بندی کا تو کسی طالب علم کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ۱۹۶۹ئہ میں حافظ ملت کے مشروط استعفاء کے بعد ایک اختلاف کھل کر سامنے آیا۔ لیکن یہ تعطیلات کے زمانہ میں ہوا۔ اگرچہ آوارکا یہ تعارض مشتہر ہو گیا۔ لیکن استعفاء کی نامنظوری اور حافظ ملت کی واپسی کے بعد سارے معاملات اپنی روش پر آگئے ——— اور ۱۹۷۱ئہ تک اساتذہ میں رواداری، عالی ظرفی، صلح وآشتی، مفاد ادارہ کے لئے ذاتی جذبات وخواہشات کی قربانی، باہمی شکوہ و شکایات، اور نمایاں اختلاف اور غیظ وغضب سے کنارہ کشی کی روایات پوری طرح برقرار رہیں۔ لیکن حافظ جی علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد خود حافظ ملت کی نگاہوں تک ایسے معاملات آئے جو عالی ظرفی، رواداری، اور مفاد ادارہ سے ہمدردی کے نقطۂ نظر سے طلبہ کے سامنے بھی نہ آنا چاہئے تھے۔ کیوں کہ ہر سطحیت اور پستی فکر وعمل کا ان کے ذہن پر بھی اثر پڑتا ہے، جو ان کے مستقبل کے لئے خطرناک اور مضر ہوتا ہے۔

جن مدارس میں اساتذہ کے درمیان اتفاق واتحاد ہو۔ وہاں طلبہ کے اندر بھی اساتذہ کا ادب واحترام نظر آئے گا۔ اصول وضوابط کی پابندی، کردار وعمل کی درستی زیادہ ہوگی۔ لیکن جہاں اساتذہ میں عداوت واختلاف برپا ہو، وہاں طلبہ کی آوارگی قانون شکنی، اعلیٰ کردار وعمل سے دوری، تعلیم وتعلم سے بیزاری، اساتذہ کی گستاخی وبے ادبی، بلکہ ان کے درمیان مزید اشتعال انگیزی، اور خود طلبہ کی گروپ بندی وغیرہ کے مناظر آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ نکتہ کوئی ایسا باریک نہیں جس

[1] اس وقت طلبہ، مدرسین اور اہل مبارکپور میں اسی لقب سے وہ معروف تھے ۱۲ مصباحی

ے کسی ادارہ کے اساتذہ بے خبر ہوں ۔ لیکن طلبہ ، ادارہ اور تعلیم کی خاطر اپنے شعلہ زن جذبات کو برف آلود کرنا بڑا زہرہ گداز عمل ہے ۔ اپنی تسکینِ انا کے لئے ہر وسیع تر مفاد قربان ہو سکتا ہے ۔ لیکن قومی مستقبل کی تعمیر کے لئے اپنے مفاد کو قربان نہیں کیا جا سکتا ۔ حافظ عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمہ اس خطرناک فکر و عمل سے زندگی بھر برد آزما رہے اور انہوں نے اپنی بے پناہ صلاحیت و مقبولیت کے اثر سے اپنے رفقاء اور متعلقین کو ہمیشہ جادۂ مستقیم پر گامزن رکھا ۔

(۲) وہ اپنے اصول کے بڑے پابند تھے ۔ درس و مطالعہ کی پابندی کے علاوہ اپنے اوپر کچھ اور پابندیاں بھی انہوں نے لگا رکھی تھیں ۔ مثلاً یہ کہ بازار سے سودا خود خریدتے غلہ ، سبزی ، ترکاری کا تھیلا خود اپنے کاندھے پر گھر تک لے جاتے ۔ اس زمانہ کے بعض طلبہ کا بیان ہے کہ ہم نے حضرت کو غلے کا تھیلا لے کر جاتے دیکھا ۔ اور ہر چند کوشش کی کہ ہمارے حوالہ کر دیں مگر کامیابی نہ ہوئی ۔ ان کا یہ عمل صرف ماہ ، دو ماہ ، یا سال ، دو سال پر مشتمل نہ تھا ۔ بلکہ مبارکپور میں ان کی ساری زندگی اسی شکل میں دیکھی گئی ۔

(۳) وہ اپنے اساتذہ کے ادب شناس اور فرماں بردار تھے خصوصاً حافظ ملت علیہ الرحمہ کے ساتھ ان کی خیر خواہی ، اخلاص و ہمدردی اور وفاداری اپنی مثال آپ ہے ۔ حافظ ملت علیہ الرحمہ جب مبارکپور چھوڑ کر ناگپور تشریف لے گئے تو تعلیم کے لئے حافظ جی علیہ الرحمہ بھی وہیں پہونچے ۔ حافظ ملت نے جب اشرفیہ کو وسیع پیمانہ پر لیجانا چاہا اور مشکلات حائل دیکھ کر بجائے مبارکپور کے کسی دوسرے شہر کا انتخاب کیا تو حافظ جی علیہ الرحمہ نے حافظ ملت اور اشرفیہ دونوں کی ہمدردی کا حق ادا کر دیا ۔ اپنے جملہ رفقا کو ہم خیال بنا کر ایسی سرگرم کوششیں کیں جن کے نتیجے میں حافظ ملت کو کہیں اور جانے کا خیال ترک کرنا پڑا ۔ اور مبارکپور ہی کی سرزمین آج حافظ ملت کے اس عظیم ادارہ کی امین بنکر سرفراز ہے ۔

(۴) وہ اپنے احباب و رفقا کے معاون و مددگار بھی تھے ۔ علمی مسائل اور درسی اشکالات

کے حل میں وہ اشرفیہ کے اساتذہ اور دیگر بلند پایہ علماء کی دستگیری میں ضرب المثل تھے ۔ فتاویٰ کے سلسلہ میں حضرت مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ طلبہ کی موجودگی میں بے تکلف ان سے رجوع کرتے ۔ اور وہ ہمیشہ بڑی خندہ پیشانی سے ان کی رہنمائی فرماتے ۔ اس سے جہاں ان کی وسعت نظر اور ان کا علمی استحضار عیاں ہوتا ہے وہیں ان کی نفع رسانی کا جذبہ، ان کی فراخ دلی اور ان پر اکابر علماء کا اعتماد بھی واضح ہوتا ہے ۔ فتاویٰ کے سلسلہ میں یوں بھی ان کو ہمیشہ تیار رہنا ضروری تھا ۔ کیونکہ فتاوی پر ان کی تصدیق بالعموم ضروری تھی ۔

(۵) سُنّی دارالاشاعت کا قیام ، اور فتاویٰ رضویہ کی اشاعت ان کا عظیم کارنامہ ہے ۔ اس پر متعدد جہتوں سے اور تفصیل سے غور کرنے کی ضرورت ہے ۔

۱ ۔ ایک کتاب جو مطبوعہ ہے عکس لیکر بعینہٖ اسے شائع کر دینا کسی خاص علمی صلاحیت کا محتاج نہیں ۔ تھوڑا پڑھا لکھا آدمی بھی اسے کر سکتا ہے ۔ بقدر ضرورت سرمایہ ہونا چاہئے پھر کتاب ایسی ہے جو مارکیٹ میں خوب چلی ہوئی ہے اور مانگ زیادہ ہے تو سرمایہ لگانا بھی آسان ہے ۔

ب ۔ لیکن کوئی کتاب جو مسودہ کی شکل میں ہے اسے کتابت کرا کے شائع کرنے میں کم از کم کتابت کی تصحیح اور مسودہ سے مطابقت کا کام علمی صلاحیت اور تجربہ کا طالب ہے، مسودہ بالکل صاف ستھرا اور اطمینان بخش ہے تو تصحیح کا تھوڑا تجربہ بھی کفایت کر سکتا ہے ۔

ج ۔ لیکن مسودہ پرانا اور ناصاف ہو تو اس کی عبارتوں اور معانی و مطالب سمجھنے کی لیاقت بھی چاہئے جس کی مدد سے ناصاف عبارتوں کی تصحیح و تعیین ہو سکے ۔

اب تصحیح کی لیاقت کا معیار مسودہ کے مندرجات کے معیار سے جانچا جائے گا ۔ مسودہ اگر افسانوں اور اختراعی قصوں پر مشتمل ہے تو صرف زبان و ادب میں کمال کار تصحیح کے لئے کافی ہے ۔

د ۔ مسودہ اگر سیر و تاریخ سے تعلق رکھتا ہے تو اس فن سے تعلق ہونا ضروری ہے لیکن مندرجات عام متداول کتابوں سے صرف اخذ و اقتباس کی شکل میں ہیں تو کام آسان ہے ورنہ اس میں دشواریوں کا دائرہ بڑھتا جائے گا۔

ہ ۔ مسودہ کسی ایسے عالم کا ہے جس سے زیادہ صلاحیت خود مصحح کے پاس ہے اور اسے حذف و اضافہ اور اصلاح کا حق بھی حاصل ہوا ہے تو بھی اس کے لئے کچھ آسانی ہے، بلکہ مصنف پر خاص مہربانی بھی۔ کیوں کہ جا بجا تصحیح کار کے علم و صلاحیت سے کتاب میں حُسن و کمال پیدا ہوگا۔ مگر قاری سب کچھ مصنف ہی کی کاوش سمجھے گا۔ اور اگر مصحح کی محنت کا کچھ تصور بھی کرے گا تو مبہم طور پر، کیوں کہ بعد تصحیح کتابت و طباعت وغیرہ سے گزر کر کتاب جب منظر عام پر آتی ہے تو ایسا کوئی نمایاں نشان شاید ہی کسی کتاب میں رہتا ہو جس سے اصل مسودہ اور اصلاح و ترمیم میں فرق کیا جا سکے۔

و ۔ مسودہ کسی بلند پایہ جامع علوم و فنون شخصیت کا ہے۔ جس کی نگارشات میں متعدد فنون کی مہارت کارفرما ہے تو ایسے ناصاف مسودہ کو تبییض و تنقیح اور کتابت و تصحیح وغیرہ سے گزار کر شائع کرنا بڑا مشکل کام ہے۔

ز ۔ یہاں بھی اگر مزاج سہل پسند ہے تو یہ ہوگا کہ جو آسانی سے سمجھ میں آیا بنا دیا ورنہ جیسا تیسا چھوڑ کر کام آگے بڑھایا۔ اشاعت کے بعد قارئین سر مغزی کرتے رہیں کہ کیا ہے، کیا ہونا چاہیئے؟۔

ح ۔ لیکن محتاط اور جفاکش انسان سخت سے سخت راہ طے کرنے کی سعی بلیغ کرتا ہے۔ جس میں بعض اوقات اسے اپنی کسی تصنیف سے زیادہ اس بلند پایہ شخصیت کے مخطوطہ کی تصحیح میں محنت و صلاحیت صرف کرنی پڑتی ہے۔

ط ۔ مسودہ دینی عقائد و احکام، نصوص قرآن و حدیث، عبارات ائمہ و علماء پر مشتمل ہے تو یہ بھی لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ ذرا سی غفلت و سستی سے جائز کا ناجائز، ناجائز کا جائز نہ بن جائے اور نصوص کی عبارتوں میں خطا نہ واقع ہو۔

ی ۔ خود مصنف کی عبارت میں بھی فرق نہ آنے پائے کہ اس کی تحریر بجائے خود ایک سند ہے ۔ ذرا بھی تبدیلی ہو گئی تو بہت ممکن ہے جو گہرائی و گیرائی ان الفاظ میں پنہاں تھی وہ رخصت ہو جائے ۔ اور کسی قاعدہ یا جزئیہ سے تعارض بھی نمودار ہو جائے یا کسی اعتراض و ایراد کی گنجائش نکل آئے ۔ جبکہ مصنف کے اصل الفاظ میں تعارض و اعتراض کی گنجائش نہ تھی ۔ بلکہ اسی تعارض و ایراد سے بچنے کے لیے اس نے ایک مخصوص تعبیر اور کچھ خاص الفاظ اختیار کئے تھے ۔

امام احمد رضا قدس سرہٗ کی جامع فنون شخصیت ، فتاوی رضویہ کی علمی حیثیت اور مسودہ کی سقیم حالت کو سامنے رکھ کر اس کی تصحیح و تبییض ، اور کتابت و طباعت میں صرف ہونے والی محنت و صلاحیت کا اندازہ کیجئے ۔ پھر جس زمانے میں کام کی ابتدا ہوئی ایسی علمی کتاب کی اشاعت سے متعلق حالات مایوس کن تھے ۔ اسی لئے سنی دار الاشاعت کی تاسیس اور طباعت و اشاعت کے حوصلہ مندانہ اقدام کی بھی داد دیجئے ۔ مسودہ کی حالت اور اس کی تصحیح میں احتیاط سے متعلق مولانا حافظ عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمہ کا بیان پڑھئے ۔ وہ رقم طراز ہیں ۔

"مسودہ مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم کے پاس بریلی تھا ۔ اس کے مبیضہ کے لئے مولانا مجیب الاسلام صاحب نسیم اعظمی کی خدمات حاصل کی گئیں ۔ جس طرح فتاوی رجسٹروں کا حال ہوتا ہے کہ ریکارڈ کے دفتر میں سوال و جواب دونوں درج کر لئے جاتے ہیں ۔ اور اصل سائل کو بھیج دی جاتی ہے وہی فتاوی رضویہ کا بھی حال تھا کہ مسائل مبوب اور مفصل نہ تھے ۔ پھر یہ بھی نہیں کہ نقل ہو جو [illegible] دفعہ تیار ہوئی تھی ۔ بلکہ نقل در نقل ہوتے ہوتے موجودہ رجسٹر ہوئی ہے .... ہم مولانا موصوف کے بڑے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے بڑی عرق ریزی سے اس کتاب کو اپنی بساط بھر مبوب و مفصل کر کے مبیضہ کیا .... بعض اوراق کیڑوں نے بری

طرح چاٹ لیا تھا۔ ان میں جہاں جہاں او[illegible] بوں [illegible]عبارت سے تصحیح ممکن تھی کردی گئی۔ جہاں تک ماسبق اور مالحق سے عبارت بن سکتی تھی بنادی گئی۔ اور جہاں مجبوری تھی بیاض چھوڑ دی گئی ہے"

(تفصیلی چارٹ عرض حال کے بعد درج ہے)

"مبیضہ کا اصل سے مقابلہ —— پھر مبیضہ سے کاپی کی تصحیح —— بعدہٗ پروف کی مطابقت میں پوری عرق ریزی اور نہایت احتیاط سے کام لیا گیا ہے —— مزید براں جہاں جہاں عربی عبارتیں نقل کی گئی ہیں، ان کی تصحیح متعلقہ کتابوں سے حتی الامکان کرلی گئی ہے —— الغرض نقطہ نقطہ، شوشہ شوشہ، کی صحت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اور پھر پوری کوشش کی گئی ہے کہ کتاب صحیح اور مسودہ کے عین مطابق شائع ہو الخ"

(فتاوی رضویہ جلد سوم، عرض حال، ص: ر، ش محررہ ۱۱ر صفر ۱۳۸۱ھ / ۲۶ر جولائی ۱۹۶۱ء)

غور فرمائیے۔ فتاوی رضویہ میں حوالوں کی کمی نہیں۔ ہر عبارت کو اصل ماخذ سے ملانا کتنا مشکل کام ہے۔ ماخذ کی جلد اور صفحہ یا باب وفصل کی نشاندہی کتاب میں موجود ہو جب بھی ہر ہر عبارت کی متعلقہ کتابوں سے مطابقت کرنا بڑا طویل اور دشوار گزار عمل ہے —— لیکن ناظرین کو معلوم ہوگا کہ بالعموم فتاوی رضویہ میں باب وفصل یا جلد وصفحہ کی نشاندہی نہیں۔ اب مسئلہ کی عبارت ٹھیک متوقع محل میں مل گئی تو خیر ورنہ نہ معلوم کتنے مقامات پر تلاش کرنا پڑے، اور کتنی مدت صرف ہو جائے، کوئی [illegible] حدیث میں الفاظ حدیث تلاش کرنا، کتب فقہ میں فقہی عبارتوں کی بہ نسبت عمومی طور نہیں [illegible] ہی مشکل ہے۔ فتاوی رضویہ میں احادیث بھی ہیں، فقہی عبارات بھی، تاریخ وسیر کے اقتباسات بھی، اور دیگر فنون کی کتابوں کے مندرجات بھی —— ان سب کو اصل ماخذ سے تلاش کرکے نکالنا اور

مطابقت کرنا بڑا صبر آزما کام ہے۔

پھر مسودہ وہ نہیں، جو اعلیٰحضرت قدس سرہٗ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو۔ بلکہ کہیں ان کی تحریر ہے، کہیں کسی ناقل کی، کیوں کہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ استفتا کسی کاغذ پر آیا۔ اس پر مفتی نے خود جواب لکھا۔ یا کسی سے لکھوا کر نظر ثانی کی۔ یا پڑھوا کر سُن لیا۔ اور دستخط کر دیا۔ پھر کسی ناقل نے فتاویٰ کے رجسٹر میں اسے نقل کر دیا۔ ناقل نے اپنی نقل پر نظر ثانی کر لی تو اس کی مہربانی، ورنہ کوئی بات نہیں ——— اور نظر ثانی اگر برق رفتاری سے ہوئی تو چھوٹے ہوئے کسی لفظ و حرف کا گرفت میں آنا مشکل ہی ہے ——— ماہرینِ نقل و تصحیح کا معاملہ الگ ہے۔

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ فتاویٰ رضویہ میں جو فتاوی نقل ہوئے ان پر نظر ثانی نہیں ہوئی، یا ناقلین تغافل کیش تھے، یا مہارت و صلاحیت سے خالی تھے۔ کیونکہ جس عمل کی تفصیلی حالت کی تحقیق نہ ہو۔ اس کے بارے میں حتمی طور پر نفیاً یا اثباتاً کوئی دعویٰ کر دینا یقیناً دانشمندی سے بعید امر ہے ——— لیکن حافظ عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمہ کا بیان یہ ہے کہ جو نقل خود اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے زمانے میں تیار ہوئی تھی بعینہٖ وہی دستیاب نہ ہوئی۔ اس کی نقل ملی۔ بعینہٖ وہ بھی نہیں۔ جو ملی وہ بھی کِرم خوردہ، ناصاف حالت میں، اب اس قسم کے مسودہ کی تحقیق و تصحیح جتنی مشکل ہے اسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہیں کام سے پالا پڑا ہو۔

امام احمد رضا قدس سرہٗ کے حاشیۂ شامی کی نقل کو اعلیٰحضرت کے اصل قلمی نسخہ سے مقابلہ کا کام جب راقم الحروف اور مولانا عبد المبین نعمانی انجام دے رہے تھے تو بہت سے مقامات پر بڑی زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ خصوصاً جلد ثانی کا مقابلہ بہت دشوار ہوا۔ جس میں راقم کے ساتھ مولانا نصر اللہ بھیروی تھے۔ کثرتِ استعمال سے بہت سے حواشی کی کچھ عبارتیں محو ہو گئی ہیں ——— اور کچھ تعیین نہ ہو سکی کہ یہاں کیا عبارت لائی جا سکتی ہے۔

جب کہ ہمارے کام میں اصل مراجع سے مطابقت کا التزام نہیں تھا۔ جہاں اصل حوالوں کو دیکھنے کی خاص ضرورت محسوس ہوئی وہیں مراجعت کی گئی۔ پھر بھی اس میں سخت محنت و دشواری سے گزرنا پڑا۔ "مقامع الحدید علیٰ خدِ المنطق الجدید" کا مبیّضہ بہت صاف تھا۔ مگر نقل در نقل کی وجہ سے متعدد مقامات پر اصل مراجع کی جانب رجوع کرنا پڑا۔ اور کافی وقت و محنت صرف کرنے کے بعد میں اسے خاطر خواہ تبییض وکتابت کے مراحل سے گزار کر منظر عام پر لا سکا۔ پھر بھی ایک دو غلطیاں رہ گئیں۔

فتاوی رضویہ کی ضخیم جلدوں میں حوالوں کی جو کثرت ہے محتاج بیان نہیں۔ ان تمام حوالوں کو اصل کتابوں سے ملانا کتنا صبر آزما اور طویل عمل ہے۔ کوئی صرف دس بیس صفحات کر کے اندازہ لگا سکتا ہے۔ اس کے پیش نظر استاذِ محترم علامہ حافظ عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمہ کی ہمتِ مردانہ، کاوشِ مجاہدانہ، اور احتیاط بلند کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ انہوں نے فتاوی رضویہ کو ایڈٹ کرنے کے سلسلہ میں جو سعی بلیغ فرمائی ہے راقم الحروف سے خود ایک بار اس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

"اتنی محنت کے بعد اتنی ضخیم کتاب خود لکھی جا سکتی تھی۔ یہ حقیقت ہے۔ میں فخریہ نہیں کہتا"۔

خود مجھے جب اس قسم کے کاموں سے سابقہ پڑا تو حضرت کا یہ مقولہ حرف بحرف درست نظر آیا۔ اور میری تفصیلات سے قارئین خود بھی اندازہ کر سکتے ہیں۔

جلد سوم اور جلد چہارم کی اشاعت خود ان کی حیات میں ہو گئی۔ جلد پنجم کے کئی سو صفحات کی کتابت بھی انہوں نے کرائی۔ جلد ششم، ہفتم، ہشتم، کے مسودات پر نظر ثانی اور تبییض کا انتظام بھی انہوں نے کیا۔ مزید جو رسائل، مضامین وابواب کے لحاظ سے ان جلدوں میں شامل ہونا چاہیئے ان کو بھی یادداشتوں میں لکھ دیا۔

طریق کار یہ تھا کہ ایک بار پوری ایک جلد کا مسودہ خود پڑھتے۔ ناصاف عبارتوں کو حاشیہ میں پنسل یا قلم سے صاف لکھ دیتے۔ اصل حوالوں کی مراجعت کرتے۔ پھر جو مبیضہ

ہوتا اس کا اصل سے مقابلہ کرتے۔ پھر کتابت کا مبیضہ سے مقابلہ کرتے۔ اور کتابت کی تصحیح کرکے کاتب کو واپس کرتے۔ کاتب اپنا نہ تھا، بلکہ پریس کا تھا۔ پروف کی تصحیح میں کاتبوں کا حال معلوم ہے کہ بہت کچھ بناتے ہیں اور کچھ چھوڑ بھی دیتے ہیں۔ یہ سانحہ فتاوی رضویہ کے ساتھ بھی ہوا۔ وجہ ہے کہ صدر الشریعہ حضرت علامہ الحاج مبین الدین صاحب امروہوی سابق شیخ الحدیث دار العلوم مظہر اسلام بریلی شریف نے اپنے جامعہ نعیمیہ مرادآباد کے زمانۂ تدریس میں جلد سوم کے مطبوعہ نسخہ پر نظر ثانی فرمائی تو کئی صفحات کا صحت نامہ تیار ہوگیا ——— حافظ عبد الرؤف صاحب کا معاملہ لکھنؤ کے پریس سے تھا۔ اور کاتب وہیں رہتا۔ اگر ان کا اپنا کاتب رہتا اور پروف کو دوسری تیسری بار دیکھنے کا موقع ملتا تو یقیناً اتنے لمبے صحت نامہ کی گنجائش نہ نکل پاتی۔

انہوں نے جو طویل مجاہدہ کیا۔ اس میں ان کا کوئی مستقل معاون نہ تھا۔ تبییض کا کام مفتی مجیب الاسلام صاحب نسیم اعظمی اور مولانا سبحان اللہ امجدی بنارسی کے ذریعہ ہوتا۔ باقی کام خود کرتے۔ مقابلہ کے لئے طلبہ میں سے چند ذی استعداد، ہی افراد کو باری باری ساتھ کرلیتے۔ اساتذہ یا علماء میں سے کسی کا اس سلسلہ میں مستقل یا طویل تعاون نہ تھا۔ اگرچہ ممکن ہے کہ چند گھنٹے کسی کسی زمانے میں کسی نے ساتھ دیا ہو، لیکن ایک گراں بار اور طویل عمل میں چند گھنٹے یا چند ایام کی رفاقت کا اگر کچھ اعتبار ہے تو اس میں ان طلبہ کا حصہ بہت زیادہ ہے جو اکثر و بیشتر بلکہ بحیثیتِ مجموعی ہمیشہ شریک کار ہوتے۔ اور ان کے شاہدوں کی کمی نہیں۔ اس زمانہ میں جو طلبہ دار العلوم میں زیر تعلیم اور مقیم تھے سبھی اس کا مشاہدہ کرتے۔

یہ سارا کام غیر درسی اوقات میں ہوتا۔ حافظ جی علیہ الرحمہ درس و مطالعہ کی بڑی سختی سے پابندی کرتے۔ اور اوقاتِ تعلیم میں کوئی خارجی کام قطعاً روا نہ رکھتے۔ اگرچہ وہ ادارہ اور جماعت کے لئے کوئی بڑا اور اہم کام کیوں نہ ہو۔ لیکن تعلیمی نقصان مقدار تعلیم کی کمی، طلبہ و ادارہ کے بنیادی مقصود اور اپنے فرائض سے بے توجہی

انہیں کسی طرح گوارا نہ تھی۔ اس زمانہ میں دیگر مدرسین بھی اسی روش پر کاربند تھے۔

فتاوی رضویہ کے سلسلہ میں ان کی علمی کاوشوں کا جو سب سے زیادہ گرانقدر اور تابناک گوشہ ہے اس پر کم لوگوں کی نظر جاتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک سارے کام کی جان اور سب سے بیش بہا جوہر وہی ہے۔ اسے میں ذرا تفصیل سے عرض کرنے کی جسارت کروں گا۔

وہ اہلِ نظر جن کا کسی مخطوطہ کی تحقیق سے سابقہ پڑ چکا ہو یا ایسے ماحول کے پروردہ ہوں جہاں اڈیٹ کا کام ہوتا ہے اور اسے خاطر خواہ اہمیت دی جاتی ہے تو وہ بہر حال مذکورہ کام کی قدر و منزلت کا اندازہ کر سکتے ہیں اور اسے قرار واقعی درجہ دے سکتے ہیں۔ لیکن ایسے افراد کو شاید انگلیوں پر گننے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ خصوصًا اس زمانہ میں جب استاذِ محترم یہ کام انجام دے رہے تھے۔

عوام تو عوام اکثر خواص اور علماء کا یہ حال ہے کہ ناول سائز کے سو پچاس صفحات پر مشتمل کوئی کتاب اگر کسی نے لکھ دی اور وہ دوسرے کی اصلاح و نظرِ ثانی اور محنت و کوشش کے بعد شائع ہوئی۔ جب بھی اسے لکھنے والے کا ایک کارنامہ شمار کرتے ہیں۔ اور اصلاح والے کو تو قطعًا کسی خانہ میں نہیں رکھتے۔ اسی طرح مصنف کے پانچ چھ سو صفحات کا مسودہ اگر کسی نے نئے انداز سے عنوانات، فہرست، پیراگراف کی تبدیلی عبارتی نشانات وغیرہ سے آراستہ کر کے شائع کیا تو یہ بھی کسی خانہ میں شمار نہیں ہوتا، کام صرف مصنف ہی کا شمار ہوتا ہے۔ مزید براں کسی بڑے مصنف کے مخطوطہ کو تحقیق و تفتیش کے ساتھ منظرِ عام پر لانا بھی کوئی زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اور اڈیٹ کرنے والے نے اپنے حزم و احتیاط، بلند پایہ ذوقِ تحقیق کے تحت مصنف کے دیئے ہوئے حوالوں اور عبارتوں کی اصل سے مراجعت بھی کر ڈالی تو یہ قطعًا مذکورہ حضرات کے لئے کوئی محسوس ہونے والی چیز ہی نہیں۔ اس لئے اُسے کچھ شمار کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اس ماحول میں ہم دیکھتے ہیں کہ علمی قابلیت اور قلمی صلاحیت رکھنے والے حضرات خود کوئی کتاب لکھنا، اور اسے کتابت، تصحیح، طباعت اشاعت، ترسیل ومراسلت وغیرہ کے تمام مراحل سے گزارنا تو گوارا کر لیتے ہیں۔ لیکن اپنے اکابر میں سے کسی بلندپایہ شخصیت کے مخطوطات پر دماغ سوزی اور جانفشانی انہیں قطعاً گوارا نہیں ——

کیوں کہ وہ جس ماحول میں رہتے ہیں اس طرح کا کام بالعموم صِفر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اُن میں بعض حضرات کے پیشِ نظر یہ خیال بھی ہو گا کہ جن موضوعات پر لکھا جا چکا ہے اور جو کام مسودہ کی حد تک ہو چکا ہے وہ کبھی بھی اور کسی کے ذریعہ بھی منظرِ عام پر آسکتا ہے۔ لیکن جو شعبے اب تک تشنۂ تحریر ہیں انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اگلی نسل سے زیادہ توقع نہیں کہ وہ خاطر خواہ ان موضوعات سے عہدہ برآ ہو سکے اس لئے خود کچھ لکھ کر جانا چاہئے۔

لیکن کیا سارے اہلِ قلم ایسے ہی ہیں۔ اور سارے اربابِ صلاحیت کے اندر یہی جذبہ کار فرما ہے؟ نہیں، بلکہ اکثر میں یہی ذوق ملے گا کہ اپنی بقا کے لئے اپنی تحریر منظرِ عام پر لانا ہی ضروری ہے۔ مجھے اس ذوق کی تحقیر قطعاً مقصود نہیں۔ یقیناً اہلِ علم اور اہلِ دین کے لئے ہر علمی و دینی کام خواہ وہ کسی کے قلم سے ہو نفع بخش اور جماعتی وقار کا ذریعہ ہے۔ جس پر توجہ اور محنت کی ضرورت سے انکار یقیناً سفاہت وجہالت کے دائرہ میں شمار ہو گا۔ ساتھ ہی ایک قابلِ قدر کام کی ناقدری، اور کام کرنے والوں کی ہمت شکنی کا بھی حامل ہو گا۔

مجھے صرف یہ واضح کرنا ہے کہ اپنی تصنیف اور اس کی اشاعت میں مصنّف کے لئے بہت سے حوصلہ افزا جذبات مہمیز کا کام کرتے ہیں۔ لیکن کسی قدیم تصنیف پر اپنی تصنیف کے برابر یا کم وبیش محنت صرف کر کے اسے شائع کرنے میں قطعاً اس قسم کے جذبات کی ہمنوائی نہیں ہوتی۔ جس کے باعث وہ بڑا ہی صبر آزما، ہمت شکن اور جانسوز کام بن جاتا ہے۔ جو کسی ایسی ہی بلند خیال، عزیمت کیش، اور پُر عزم شخصیت کے خانۂ اعمال

میں شامل ہو سکتا ہے، جیسے اخلاص و بے نفسی، دینی امنگ، سرمایۂ علمی سے محبت، اکابر سے عقیدت، جماعت سے ہمدردی، اپنی ناموری، اور عزت و شہرت کے نفع بخش اور ہمت افزا تصوّرات سے کنارہ کشی کا وافر حصّہ قدرت نے ارزانی کیا ہو۔

میرا جہاں تک اندازہ اور مشاہدہ ہے وہ یہی کہ استاذ محترم نے جس زمانے میں کام کیا ہے، ماحول کماحقہٗ قدر شناسی کا نہ تھا۔ اور ان کی جو کچھ پذیرائی ہوئی، وہ ان کی محنتوں کے تناسب سے نہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ عرصۂ دراز سے اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی قلمی کتابیں منظرِ عام پر آنا بند تھیں۔ ایک قلمی کتاب جو بہت ساری چھوٹی چھوٹی کتابوں پر بھاری ہے فتاوی رضویہ۔ اسے مولانا حافظ عبد الرؤف صاحب قبلہ نے شائع کر دیا۔ مگر اشاعت کی دشواری اور اس طویل سفر کی سرگزشت ۔۔ اس کے دشوار گزار مراحل کیا ہیں، اور کس طرح سر ہوئے۔ اس کا صحیح اندازہ کرنے اور اس پر ناشر کو مبارکباد دینے والوں کی تعداد پورے برّصغیر میں سو بلکہ پچاس افراد تک بھی نہ رہی ہوگی۔

انتہا یہ ہے کہ ان کے قریبی رفقا کو بھی اس راہ میں شب و روز کی مشقتوں، محنتوں اور قربانیوں کا کوئی تجربہ اور صحیح اندازہ نہ تھا۔ بحر العلوم حضرت مفتی عبد المنان صاحب اعظمی کے یہ الفاظ چشم بصیرت سے پڑھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہیں:

"مولانا عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمہ اکیلے ہی سب کام کر لیا کرتے تھے۔ اس لئے ہم لوگوں کو کچھ احساس نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب جبکہ کام سے سابقہ پڑا تو معلوم ہوا کہ کام کتنا مشکل اور زہرہ گداز ہے۔"

جس دور میں متبحر قسم کے اربابِ فضل و کمال کو کسی عظیم مخطوطہ کی تحقیق و اشاعت کی راہ میں پیش آنے والی دشواریوں اور جاں گداز مراحل کا اندازہ نہ ہو اس وقت کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ عام اہل علم کی طرف سے کماحقہٗ کوئی پذیرائی اور حوصلہ افزائی ہوئی ہو، پذیرائی اور ہمت افزائی اسی وقت بروئے کار آ سکتی ہے جب اس کے پیچھے

قدر آشنائی اور عمل شناسی موجود ہو۔

الحاصل ان حالات میں حضرۃ استاذ کے طویل مجاہدہ کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اب بلاشبہہ ماحول بدل چکا ہے۔ اور علم و فن، تجربہ و عمل کی ترقی کے ساتھ قدروں اور قدردانیوں میں بھی ترقی آئی ہے۔ اس لحاظ سے تمام تر دشواریوں کے باوجود مردانِ کار کی تسلّی و ہمت افزائی کے لئے بفضلہٖ تعالےٰ بہت کچھ سامانِ پذیرائی فراہم ہو چکا ہے۔ ہمت کر کے اس قسم کے مشقت خیز کاموں کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

فتاوی رضویہ کے سلسلہ میں اب تک جو کچھ بیان ہوا وہ اس میں صرف ہونے والی علمی صلاحیت اور صلہ و ستائش سے دور رہ کر مخلصانہ سعی و محنت کا جائزہ ہے، لیکن حضرت کی بے نفسی اور جانفشانی کا یہ صرف ایک رخ ہے۔ انہماک و دلسوزی کا ایک رخ اور ہے، جو بڑا ہی درد انگیز اور عبرت خیز ہے۔

کسی محقق طبع اور بلند حوصلہ عالم و فاضل کے لئے کسی علمی و تحقیقی کام میں ایک روحانی سرور اور علمی جوش و ولولہ کارفرما ہوتا ہے جو اس سے بڑی سے بڑی تحقیقات کرا لیتا ہے۔ ایسی تفتیش و جستجو بھی جسے آنے والی دنیا نہ جان سکے نہ اس پر کوئی داد دے سکے۔ لیکن محقق کا ذوق تحقیق ہوتا ہے، جو ساری محنتوں سے اسے مردانہ وار گزار دیتا ہے ——— لیکن کسی بلند رتبہ عالم کے لئے ایسا کوئی کام سرانجام دینا بڑا مشکل ہوتا ہے، جس میں کسی علمی سرور اور ذہنی تسکین کا سامان بھی نہ ملتا ہو مثلاً کتابت کے لئے کاتبوں سے معاملہ کرنا، اُجرتوں کی تعیین، کتاب کے تقاضوں، اور لین دین کے مراحل سے گزرنا، پریس جانا، کاغذ خریدنا، پریس پہونچانا، کتاب چھپ گئی تو پارسل بنوانا، حمل و نقل کے ذرائع سے معاملہ کرنا، اپنے شہر میں لانا، مستقر تک ڈھونا، یا پہنچوانا، پھر کتاب کی نکاسی اور دوسری کتاب کی تیاری کے لئے خریداروں کو مطلع کرنا، اشتہارات نکالنا، آرڈر آ گئے تو پارسل بنانا، بِل تیار کرنا، پتے درج کرنا،

اِرسال کرنا، منی آرڈر وصول کرنا، بقایا رقوم کے لئے تقاضے کے خطوط لکھنا، حسابات درج کرنا، یہ سب ایسے مراحل ہیں، جن سے نفسِ علم و تجربہ میں تو اضافہ ضرور ہوتا ہے، لیکن عموماً ان سب کا کسی علمی کام کے خانہ میں نہ شمار ہوتا ہے نہ دماغ سوز محققین کو ان سے کوئی علمی سرور حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ان کے لئے اور ان کے کاز کے لئے بسا اوقات مضر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس سے پریشاں خاطری اور بعض لوگوں کے اندر چڑچڑاپن بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جو اوقات اس میں صرف ہوتے ہیں وہ علمی کام میں صرف ہوں اور اسے دوسرے لوگ انجام دیں تو یہ عالم و محقق کی صلاحیتوں کا مناسب اور بہتر استعمال ہوگا۔ اور جو تحقیقی کاموں کی استعداد نہیں رکھتے مگر معاملات میں ہوشیار و تجربہ کار ہیں، ان کا بھی ایک دینی علمی تبلیغی شعبہ سے قریب اور مناسب مصرف نکل آئے گا۔ اور وہ اگر حسنِ نیت سے اس کاز کو آگے بڑھائیں تو اجر عظیم کے مستحق بھی ہوں گے۔

اب آپ کو یہ سُنکر حیرت ہوگی اور درد و الم بھی کہ مولانا حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ نے فتاوی رضویہ کے ساتھ صرف علمی و تحقیقی محنتیں ہی نہیں صرف کی ہیں، بلکہ وہ سارے مراحل طے کئے ہیں جو ایک ماہرِ حساب کلرک، ایک ماہر معاملہ کار، (طباعت، ترسیل و مراسلت کرنے والے ذمہ دار) کو کرنا چاہئے تھا۔ مگر سُنّی دارالاشاعت کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ دو مستقل ملازموں کی گنجائش نکل پاتی۔ نہ ہی اشرفیہ کی بھری بزم میں کوئی ایسا مونس و غمخوار، جو اس قسم کی غیر علمی جانفشانی اپنے ذمہ لے سکے۔ علمی کاموں کے لئے عذر یہ تھا کہ ان کے لئے جو صلاحیت و دیدہ وری درکار ہے اس کے لائق آپ ہی کی ذات گرامی ہے۔ اور غیر علمی کاموں کے لئے یہ عذر کہ ہمیں نہ اس کا کوئی تجربہ ہے، نہ یہ کام ہماری شانِ والا کے لائق۔ مگر جس نے کام کا بیڑا اٹھایا ہے اسے تو بہر حال ہر ”ہفت خواں“ سر کرکے ہی گزرنا ہے۔

استاذ گرامی مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ جلد نہم کے ابتدائیہ میں رقمطراز ہیں۔

"واقعہ یہی ہے کہ مولانا عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ سُنّی دارالاشاعت کی اسکیم بنانے والے تنہا تھے۔ اس کے بعد چندہ وصول کرنے میں وہی پیش پیش، بریلی شریف سے فتاوی کا مسودہ وہی لائے۔ مبیضہ انہوں نے کرایا دونوں کا مقابلہ حرف بحرف انہوں نے ہی کیا۔ پریس والوں سے معاملہ انہیں کا کام تھا۔ کاپی، پروف، فہرست وعنوان کی تیاری، بار بار لکھنؤ جانا، حتی کہ کتاب بھی خود ہی لانا، اور یہاں طالب علموں کے ساتھ مل کر بنڈل ڈھونا، کس کس بات کو یاد کیا جائے۔ کتاب چھپ گئی تو لوگوں کو خطوط لکھنا، آرڈر بک کرانا، ان کے لئے پارسل سینا، اس کو بھیجنا، کون سا کام ہے جو تنہا مولانا نے نہ کیا ہو۔ اور اس خاموشی اور بے نیازی سے کہ نہ صلے کی خواہش، نہ داد کی پروا۔"

یہی خاموشی وبے نیازی ان کے کام کی جان اور ان کی روحانیت کا اصل روپ ہے۔ جسے دیکھ کر استاذ محترم علامہ عبدالرؤف بلیاوی علیہ الرحمہ کے استاذ الاستاذ حضرت صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ کی وہ کاوشیں اور غیر علمی محنتیں یاد آتی ہیں جو انہوں نے مطبع اہل سنت بریلی شریف سے تصانیف امام احمد رضا اور دوسری علمیات کی اشاعت کے تعلق سے تدریس وافتاء اور فیصلہ وقضا وغیرہ کی عظیم ذمہ داریوں کے ساتھ سرانجام دیں۔ جن پر آج داد دینے والا بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ مگر ابنائے زمانہ کے لئے جائے عبرت ہے کہ اشاعتِ دین کی راہ میں وسائل کی کمی، مخلصانہ تعاون کی قلت، اور خالص علمی جد وجہد سے سرمایہ داروں کی بے خبری وبے توجہی کے باعث ایک بلند پایہ عالم بلکہ راس العلماء کو اپنے اونچے منصب سے بہت نیچے اتر کر بھی نہایت دلسوزی وجانفشانی کے ساتھ بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اخلاص وللہیت کا جذبۂ فراواں، اور خدمتِ دین کا سوز دروں ایک ایسا سررشتہ ہوتا ہے جو بلند وپست دونوں قسم کے کاموں کو ربِ قدیر وکریم کے حضور

خاص اور قرب جاں نواز ہیں، ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ اور اس کی قدر داں، قدر افزا، اور فضل فرما سرکار میں مخلصین کی کوئی بھی محنت و کاوش رائیگاں نہیں جاتی۔ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا نَصِیْبًا مِّنْہُ۔

سُنّی دارالاشاعت کی حیثیت

یہ تو متعین ہے کہ سُنّی دارالاشاعت کا قیام ایک قومی ادارہ کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ اس کے لئے ملک کے مختلف گوشوں سے باضابطہ عوامی چندہ فراہم کیا گیا حافظ ملت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب مرادآبادی علیہ الرحمہ شیخ الحدیث دارالعلوم اشرفیہ نے جامع مسجد مبارکپور میں اس کی تاسیس اور ضرورت واہمیت کا ذکر فرماتے ہوئے چندہ کی اپیل کی اور دیگر متعدد مقامات پر اس کے لئے تعاون حاصل کیا گیا۔ چندہ کا کام عموماً وفد کی صورت میں ہوتا۔ جس میں حافظ ملت بھی شریک ہوتے اور اشرفیہ کے بعض اساتذہ بھی، مولانا عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ رقمطراز ہیں۔

"طباعت کے سلسلے میں سب سے اہم اور بنیادی سوال سرمایہ کا تھا۔ اور عوام اہل سنت کی غربت کی وجہ سے نہایت مشکل بھی، اس لئے اراکین سُنّی دارالاشاعت کو بے حد جد و جہد کرنی پڑی۔ اور یوپی، بہار، بنگال سبھی جگہ دورہ کرنا پڑا تب جاکر رقم فراہم ہوئی۔ بریلی میں محترم ساجد علی خاں صاحب، مولانا شریف الحق صاحب، اور مولوی مجیب الاسلام صاحب جمشید پور میں علامہ ارشد القادری صاحب، ضلع گونڈہ میں تلسی پور، لوکھوا بلرام پور، اوڑاجھار، علاقہ بھانبھر میں پچپڑوا، رام نگر، ناڈیہ، بستی میں خلیل آباد، براؤں، امرڈوبھا، مہنداول، ضلع اعظم گڈھ میں مبارکپور، خیرآباد، ابراہیم پور، محمدآباد، سگڑی، مئو، ادری، گھوسی وغیرہ مختلف دیار وامصار کے احباب اہل سنت نے ہر طرح مدد کی جس کے لئے ہم سبھی احباب کے شکرگزار ہیں۔" (عرض حال صفحہ ش، فتاوی رضویہ سوم)

اس تفصیل کی روشنی میں امر واضح ہے کہ سنّی دار الاشاعت مولانا عبد الرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذاتی ادارہ نہ تھا —— بلکہ خود مولانا عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمہ کی تحریروں سے یہ بھی واضح ہے کہ سنّی دار الاشاعت دار العلوم اشرفیہ ہی کا ایک شعبہ ہے۔

جنوری تا دسمبر ۱۹۵۹ء کی کارکردگی پر مشتمل دار العلوم اشرفیہ کی سالانہ روداد کے صفحہ ۴۲ پر یہ رپورٹ درج ہے۔

"یہ مستقل شعبہ دار العلوم کے حوصلہ مند مدرسین **سنّی دار الاشاعت** کی نگرانی میں قائم ہوا ہے۔

اس کے لئے ابتدائی سرمایہ دس ہزار روپے طے کیا گیا ہے۔ جس میں سات ہزار روپے بذریعہ چندہ فراہم ہو چکے ہیں۔ ادارہ کی سب سے پہلی اشاعت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز کی فتاوی رضویہ جلد ثالث (کتاب الصلوٰۃ) ہوگی۔ اگر قوم نے ادارہ کی ہمت افزائی کی تو یہ مفید ادارہ اہل سنت کی بیش بہا تصانیف شائع کرتا رہے گا۔"

تیسری جلد چھپ کر منظر عام پر آئی تو دار العلوم کی روداد میں یہ رپورٹ شائع ہوئی۔

"دار العلوم کے حوصلہ مند مدرسین کی نگرانی میں قائم ہونے والا یہ اہم ادارہ ہے جس کی طرف سے پہلی معرکۃ الآرا کتاب فتاوی رضویہ جلد سوم مارکیٹ میں آگئی ہے۔ تقریباً ساڑھے آٹھ سو صفحہ پر پھیلا ہوا معرفت اور علوم اسلامیہ کا یہ بیش بہا خزانہ دار العلوم کے عظیم کارناموں کی ایک تازہ مثال ہے۔ اگر قوم نے اس کی اشاعت میں ہاتھ بٹا کر ہماری ہمت افزائی کی تو اس کی بقیہ جلدیں منظر عام پر آجائیں گی۔ چوتھی جلد کی طباعت کے انتظامات ہو رہے ہیں۔" (ص ۴۲ روداد رجب ۱۳۸۰ھ تا جمادی الآخرہ ۱۳۸۱ھ / دسمبر ۱۹۶۰ء تا دسمبر ۱۹۶۱ء)

سنہ مذکور تک حاجی محمد عمر صاحب ناظم اعلیٰ تھے۔ اس کے بعد جب مولینا قاری محمد یحییٰ صاحب ناظم اعلیٰ اور مرتب روداد ہوئے تو ان کی نظامت میں بھی سنی دارالاشاعت سے متعلق مذکورہ بالا رپورٹ شائع ہوتی رہی۔ ۸۱،۸۲ھ کی روداد ص ۵ پر بعینہٖ وہی الفاظ درج ہیں جو اوپر نقل ہوئے ——— اس کے بعد ۸۲،۸۳ھ کی رپورٹ میں صرف یہ ترمیم ہے کہ "بلکہ اس کا (جلد سوم کا) پہلا ایڈیشن ختم ہو رہا ہے۔ چوتھی جلد کی طباعت شروع ہو گئی ہے الخ" ——— ۸۳،۸۴ھ کی رپورٹ میں بھی یہی الفاظ ہیں ——— ۸۴،۸۵ھ کی روداد میں جلد چہارم سے متعلق کام کی دشواری کا ذکر ہے۔ باقی خبر حسب سابق ہے۔ الغرض سالہائے مذکورہ اور دیگر سالوں کی رپورٹوں میں اس بات کی واضح صراحت موجود ہے کہ یہ دارالعلوم ہی کا ایک مستقل شعبہ ہے اور فتاوی رضویہ کی اشاعت دارالعلوم ہی کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

مزید براں جب جلد چہارم منظر عام پر آئی تو ۱۳۸۶،۸۷ھ مطابق ۱۹۶۶،۶۷ء کی روداد میں خود ناظم سنی دارالاشاعت کی طرف سے یہ اطلاع شائع ہوئی۔

"فتاوی رضویہ جلد چہارم صفحات ۷۵۰، سائز ۲۲×۱۸ / ۴×۱ کاغذ گلیز، کتابت طباعت معیاری، قیمت مجلد ۲۴ روپئے غیر مجلد ۲۰ روپے، ملنے کا پتہ: سنی دارالاشاعت اشرفیہ، مبارکپور، اعظم گڈھ یوپی۔

دارالعلوم اشرفیہ مبارکپور اپنی نمایاں دینی خدمات کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں رہا۔ شعبۂ تعلیم اور دارالافتاء کے ساتھ ساتھ فتاوی رضویہ کی طباعت ادارہ کی غیر معمولی خدمت ہے"۔

۸۷،۸۸ھ کی روداد میں بھی جلد چہارم کا اشتہار اور جلد پنجم کے انتظام کی اطلاع دی گئی ہے۔ ان سب سے یہ معاملہ بالکل واضح ہے کہ ناظم سنی دارالاشاعت حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب بلیاوی علیہ الرحمہ نے اپنی تمامتر توانائیاں صرف کرنے کے باوجود سنی دارالاشاعت کو دارالعلوم ہی کا ایک شعبہ اور فتاوی رضویہ کی اشاعت

کو دارالعلوم ہی کا ایک کارنامہ قرار دیا۔

مالِ دنیا کی طمع، اور شہرت و ناموری کی حرص استاذِ مرحوم کے پائے ثبات کو کبھی لغزش نہ دے سکی۔ وہ اپنی عُسرت کے باوجود ہمیشہ قومی سرمایہ کے امین اور مادر علمی کے دردمند مخلص کی صورت میں جلوہ گر رہے۔ ہر پست حرص و طمع کو انہوں نے ہمیشہ یہ کہتے ہوئے ٹھوکر ماری ؎

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ　　　　کہ عَنقا را بلند است آشیانہ

۱۴ر شوال ۱۳۹۱ھ جمعہ کو جب استاذِ محترم کا وصال ہوا تو اس وقت دارالعلوم اشرفیہ کے سابق شیخ الحدیث اُستاذنا الکریم حافظ ملت علامہ شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ اشرفیہ کے سربراہِ اعلیٰ اور تمام شعبوں کے مرجع تھے ——— حافظ عبدالرؤف صاحب کی اچانک رحلت کے بعد بقول استاذ گرامی مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ "سُنّی دارالاشاعت کی بے گور وکفن لاش پڑی رہی" سُنّی دارالاشاعت کے ارکان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ نہ اس اِدارہ کی کوئی فکر، خیال آیا تو اسی کو جو تمام شعبوں کا مرجع وماویٰ تھا۔

حافظ ملّت نے اسے نشأۃ ثانیہ بخشی۔ ناظمان دارالعلوم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب اور حضرت مولانا قاری محمد یحییٰ صاحب کو اس کام پر مامور فرمایا۔ ان لوگوں نے حساب کتاب کر کے گاڑی کو ایک رخ پر لگایا۔ چونکہ یہ حضرات مدرسہ کی انتظامیات میں مصروف رہتے تھے اس لئے انہوں نے حضرت مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ کو آمادہ کیا۔ اور انہوں نے اس کی بہت ساری ذمہ داریاں اپنے سر اٹھالیں۔

جب سنی دارالاشاعت کی تاسیس ہوئی اُس وقت بھی حافظ ملت قدس سرہ نے اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا اور نہ صرف یہ کہ خوشی ظاہر کی بلکہ اس کے لئے خون کی فراہمی اور مالیاتی دوروں میں بھی حصہ لیا۔ سرمایہ کے حصول میں ان کے اثر ورسوخ اور ان کی شخصیت پر قوم کے عظیم اعتماد کا بھی بہت بڑا دخل ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب چھپ کر آگئی تو

مایوس کن حالات میں اس کی نکاسی کے لئے بھی زبردست جدوجہد کی۔ تقریری جلسوں میں اس ضخیم کتاب کی جلدیں ساتھ لے کر جاتے، اہل علم اور اہل ثروت کو ترغیب دے کر خرید واتے اور واپس آکر قیمت ناظم ادارہ کے حوالہ کرتے۔ بظاہر یہ کام بڑا آسان معلوم ہوتا ہے لیکن کسی بلند پایہ شخصیت کو ایسی ضخیم کتابوں کی "مفت بار برداری" سے سابقہ پڑے تو پتہ چل سکے گا کہ اس کے لئے کتنی ہمدردی محنت اور ہمت واخلاص کی ضرورت ہے۔

حساب کا جائزہ: حضرت مفتی عبدالمنان صاحب کے قلم سے جلد پنجم کے آغاز میں جو رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس کی روشنی میں میں نے حساب لگایا تو ثابت ہوا کہ فتاویٰ رضویہ سوم کی طباعت کے وقت دس ہزار روپیہ کے قریب جو رقم فراہم کی گئی تھی وہ مع نفع کے حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ کے وصال کے وقت کل کی کل موجود تھی۔ اگرچہ کاغذ اور کتابت وغیرہ کی شکل میں تھی۔ نقد صرف سو روپے تھے۔

فتاویٰ رضویہ سوم کی قیمت بارہ ۱۲ روپئے رکھی گئی تھی۔ جس کے بارے میں جلد چہارم کے شروع میں یوں تصریح ہے کہ:-

محرم ۱۳۷۹ھ مطابق جولائی ۱۹۵۹ء میں فتاویٰ رضویہ جلد سوم کا اہتمام شروع ہوا۔ ۲۷ صفر ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۰ اگست ۱۹۶۱ء کو کتاب منظر عام پر آگئی۔

جس وقت کتاب شائع ہوئی ماحول انتہائی تاریک، حالات بیحد مایوس کن اور ہمت شکن تھے۔ خود ناشر کو یہ بھروسہ نہیں تھا کہ ایسی ضخیم اور خالص علمی کتاب نکل سکے گی۔ اس لئے اس وقت دام بھی تقریباً لاگت کے برابر رکھا گیا تھا۔ اور تاجرانہ اصول کے خلاف کمیشن وغیرہ کا جھگڑا ختم کر دیا گیا"

(جلد چہارم، عرض حال، صفحہ ف بقلم مولانا عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ)

اس بیان کی روشنی میں اندازہ ہوا کہ لاگت دس روپے تھی اور قیمت بارہ روپے رکھی گئی۔ جلد چہارم کی اشاعت کے وقت جلد سوم کے ڈیڑھ سو نسخے موجود تھے۔

جن کی مالیت ڈیڑھ ہزار روپے ہوتی ہے۔ جلد چہارم کی قیمت بتیس[۳۲] روپئے رکھی گئی تھی۔ اور یہ تقریباً لاگت کے برابر نہ تھی۔ بلکہ تاجروں کو کمیشن دینے کا خیال بھی رکھا گیا تھا۔ اس لئے اس کی لاگت تقریباً چودہ[۱۴] ہزار روپئے ہوگی۔ مزید رقم کی فراہمی کے لئے یا تو چندہ ہوا ہو یا قرض لیا گیا ہو۔ چندہ کی کوئی اطلاع نہیں۔ اس لئے قرض ہی قرینِ قیاس ہے۔ اب حضرت کے وصال کے وقت جو اثاثہ ملا وہ حسب ذیل ہے میں نے اُس زمانہ کے ریٹ کا لحاظ کرتے ہوئے ہر چیز کی تخمینی مالیت متعین کی ہے۔

اثاثہ	مالیت
• کلام مجید ۱۰۰ نسخے	۱۵۰۰
• فتاوی رضویہ جلد سوم ۱۰۰ نسخے	۱۰۰۰
• فتاوی رضویہ جلد چہارم ۳۰۰ نسخے، لاگت فی نسخہ ۱۴/- روپئے	۴۲۰۰
• متفرق کتابیں جو تبادلہ میں آئیں	۱۰۰۰
• نقد	۱۰۰
• کتابت جلد پنجم ۴۳۳ صفحات، بحساب ۵/- روپئے فی صفحہ	۲۱۶۵
• طباعت شدہ جلد پنجم ۹۶ صفحات	
• کاغذ ۲۴ ریم بحساب ۵۰/- روپئے فی ریم	۱۲۰۰
• طباعت ۲۴ فارم بحساب ۱۰/- روپئے فی فارم	۲۴۰
• ۶۶ ریم کاغذ پریس کے ذمہ، بحساب ۵۰/- روپئے فی ریم	۳۳۰۰
تیرہ ہزار آٹھ سو پانچ روپئے صرف	۱۳۸۰۵

جلد چہارم کی طباعت میں تقریباً چودہ[۱۴] ہزار روپئے صرف ہوئے جس میں کم از کم دو ہزار روپئے قرض کی رقم ضرور تھی۔ جسے واپس کرنے کے بعد بھی تقریباً

چودہ ہزار روپے کا اثاثہ مکمل طور پر سنّی دارالاشاعت کے تحت موجود تھا جس کا سبب یہ ہے کہ جلد چہارم کچھ نفع کے ساتھ فروخت ہوئی۔ واضح رہے کہ میں نے جو مالیت متعین کی ہے وہ کم سے کم اندازہ کے مطابق ہے۔ ممکن ہے اصل مالیت اس سے زیادہ بنتی ہو۔ لیکن اس سے کم ہرگز نہ ہوگی۔

اس تفصیل کی روشنی میں استاذ گرامی حضرت علامہ حافظ عبدالرؤف صاحب کی امانت و دیانت کا جوہر عیاں ہے۔

اب یہ شعبہ مکمل طور پر حضرت مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ کے زیر تصرف ہے جس کی ابتدا ماسبق میں ذکر ہو چکی ہے۔ حضرت ممدوح کے زیر اہتمام ششم، ہفتم، ہشتم شائع ہوئیں۔ اور پنجم کا بھی اکثر حصہ انہوں نے ہی مکمل کرا کے شائع کیا۔ تقریباً بیس۲۰ سال سے وہ یہ خدمت سر انجام دے رہے ہیں۔ کام کی جو دشواری اور صعوبت ہے اس پر سیر حاصل گفتگو شروع میں ہو چکی ہے ——— موصوف خود ایک متبحر عالم، صاحب طرز اہل قلم اور کہنہ مشق مصنف ہیں وہ چاہتے تو اسے چھوڑ کر خود اپنی کتابیں منظر عام پر لاتے۔ مگر اپنی بہت سی تصانیف نا تمام چھوڑ کر اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے رشحات قلم کی تحقیق و اشاعت میں وقت اور محنت صرف کرنا تمام اہل علم کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔ اس میں جو ایثار ہے اسے بہت کم لوگ سمجھ پاتے ہیں۔ کیوں کہ اب بھی ایسے افراد زیادہ تعداد میں ملیں گے جو تصنیف کو بہت اہم خدمت شمار کرتے ہیں۔ اور تحقیق و اشاعت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے حالاں کہ نہ ہر تصنیف اہم اور مشکل ہوتی ہے نہ ہر اشاعت سہل اور آسان ——— اب تو ایسی ایسی غیر معیاری اور سطحی کتابیں دیکھنے کو ملتی ہیں جنہیں تصنیف کا باوقار نام دینا ہی بے جا ہے ——— اور کسی جامع علوم اور ماہر فنون کے قلمی مسودے کی تحقیق کر کے اسے صحت کے ساتھ شائع کرنا ایسا دشوار گزار عمل ہے جس میں اچھے اچھے علماء نا تجربہ کار ثابت ہوتے ہیں۔ اور ان کی شائع کردہ کتابوں میں

قاری کو بیشمار الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح کا فرق ہرگز نظر انداز نہیں ہونا چاہئے۔

بہر حال امام احمد رضا قدس سرہ کے فتاوائے مبارکہ کی تحقیق واشاعت وہ اہم خدمت ہے جس پر مولانا حافظ عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمہ کے بعد بحر العلوم کے بھی ہم بے پناہ ممنون ہیں۔ ربِ کریم انہیں سبھی اہل علم کی جانب سے جزائے فراواں عطا فرمائے ——

بھیرہ۔ ولید پور	محمد احمد مصباحی،
۲۵ ر رجب ۱۴۱۰ھ پنجشنبہ	رکن المجمع الاسلامی
۲۲ ر فروری ۱۹۹۰ء	استاذ دار العلوم اشرفیہ مبارکپور

حافظ ملت اور مولانا عبدالرؤف علیہما الرحمہ کے نامور شاگرد

حضرت مولانا کاظم علی عزیزی بستوی مرحوم

از مولانا مبارک حسین مصباحی مدیر ماہنامہ اشرفیہ، مبارکپور،

مولانا مرحوم کا جہاں صاحب تذکرہ علامہ عبدالرؤف بلیاوی علیہ الرحمہ سے تعلق ہے اس کتاب سے بھی خاص تعلق ہے، کتاب کی کتابت بہت پہلے ہوچکی تھی، موصوف چاہتے تھے کہ جلد اس کی طباعت بھی ہوجائے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ اس کے مصارفِ طباعت کے لئے اپنے کچھ احباب ممبئی کو متوجہ کروں گا، انشاء اللہ تعالےٰ انتظام ہوجائے گا۔ احباب سے کہنے کا تو علم نہیں، مگر اپنے فرزندوں سے فرمایا تھا کہ اس کتاب کی اشاعت کا انتظام کردو۔ مشیت ایزدی کہ فرمائش کی تکمیل ان کی وفات کے بعد ہورہی ہے۔ عزیز مکرم مولانا مبارک حسین رام پوری کی خواہش موصوف کے وصال پر ان کے جو حالات میں نے اشرفیہ کے اداریے میں لکھے تھے شامل کتاب کرلئے جائیں تاکہ ان کا بھی مختصر تذکرہ محفوظ ہوجائے۔ اور صاحب تذکرہ کے بے شمار تلامذہ میں سے کم از کم ایک شاگرد کا قدرے تفصیلی ذکر آجائے۔ میں نے یہ رائے مناسب سمجھی اور یہ وقیع تعارف کاتب صاحب کے حوالہ کردیا جو آپ کے سامنے ہے۔ محمد احمد مصباحی (۸ رجب ۱۴۱۳ھ ریکم جنوری ۱۹۹۳ء جمعہ)

حضرت مولانا کاظم علی عزیزی مصباحی ایک بلند پایہ مدرس، متبحر عالم دین، وسیع النظر کثیر المطالعہ، انتہائی ذہین وفطین، بے پناہ علمی صلاحیتوں کے مالک، حد درجہ متقی و پرہیزگار اور ہر دل عزیز، معتبر، قد آور اور مثالی استاذ تھے۔ ان سارے علمی محاسن و کمالات کے ساتھ ساتھ بڑے نیک طینت، خوش خلق اور خاموش طبع تھے۔ نہ ظاہری ولسانی طمطراق تھا، نہ قول وعمل میں تضاد، نام ونمود، شہرت ونام آوری اور جاہ و منصب کے کبھی خواہاں نہ رہے۔ تواضع وانکسار، خاکساری و فروتنی جیسے الفاظ عام طور

پر بولے جاتے ہیں مگر ان اوصاف کے حامل کم نظر آتے ہیں۔ لیکن مولانا موصوف علیہ الرحمہ بلا شبہہ ان اوصاف کی سچی تصویر تھے۔ جلسہ ہو یا جلوس، جلوت ہو یا خلوت مسند تدریس ہو یا کرسی خطابت ہر جگہ تواضع و خاکساری کے پیکر نظر آتے تھے۔ نہ لباس و پیرہن میں کوئی سج دھج، نہ لب و لہجہ میں شوخی و بانکپن، اخلاص و دردمندی، بڑوں کا ادب، انسبتوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت و نوازش ان کی فطرت میں داخل تھی۔ حضور حافظ ملت اور الجامعۃ الاشرفیہ کی محبت میں تاعمر سرشار رہے۔ ان کے خلاف ایک لفظ سُن نہیں سکتے تھے۔ اور یہ سب کچھ کیوں نہ ہوتا ان دونوں سے رشتہ ہی اتنا مقدس اور نازک تھا۔ حضور حافظ ملت آپ کے پیر و مرشد اور مخلص استاذ تھے۔ اور جامعہ اشرفیہ مادر علمی ———— انہیں دونوں کی برکتوں، عنایتوں اور نوازشوں نے آپ کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر ہم دوش ثریا کیا تھا۔ سال میں آپ دو مرتبہ جامعہ اشرفیہ میں تشریف لاتے تھے۔ سالانہ تقریری امتحان کے موقع پر، اور عرس عزیزی کے ایام میں، انہیں موقعوں پر مجھے بڑے قریب سے دیکھنے اور متعارف ہونے کا موقع ملا تھا۔ دو کتابوں (بخاری شریف، توضیح تلویح) کے امتحان دینے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ جب آپ امتحان لینے تشریف لاتے تھے تو طلبہ عام طور پر اس بات کے متمنی رہتے کہ کسی کتاب کا امتحان ان کے پاس ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ آپ اپنی علمی جلالت اور فلسفیانہ رعب و طمطراق سے طلبہ کو مرعوب نہیں کرتے تھے کہ طلبہ حواس باختہ ہو کر زبان ہی نہ کھول سکیں۔ اور جواب مستحضر ہونے کے باوجود قوت گویائی ساتھ نہ دے سکے بلکہ آپ بڑے نرم، سادہ اور ٹھہرے ہوئے لب و لہجہ میں سوال کرتے۔ اور طلبہ انتہائی سکون و اطمینان سے جواب دیتے۔ اور کسی قسم کا بوجھ محسوس کئے بغیر جو کہنا چاہتے کہہ دیتے۔ آپ کے احباب و متعلقین میں صاحبان جبہ و دستار بھی ہیں، اور واعظان خوش بیان بھی، ارباب ثروت و اقتدار بھی، اور اصحاب علم و فضل بھی، مگر آپ کی علمی لیاقت، فکری صلاحیت، تواضع اور سادگی کے سب معترف نظر آتے ہیں۔

آپ کی پیدائش ضلع بستی کی مشہور تحصیل خلیل آباد کی ایک مسلم معاشرتی آبادی موضع

دیوریا کے غریب، دیندار اور پاکباز خاندان میں ۱۹۳۲ء کو ہوئی۔

ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں حاصل کی۔ اس کے بعد دار العلوم تدریس الاسلام بسڈیلہ میں داخلہ لیا۔ یہاں اس مدرسہ کے مدرس اول مولانا فاروق فیض آبادی سے میزان سے شرح جامی تک، اور فقہ میں شرح وقایہ تک پڑھا۔ حضرت مولانا صوفی نظام الدین اور حضرت مولانا سخاوت علی صاحب آپ کے ابتدائی ہم سبق رفقا تھے۔ بڑھتی ہوئی تعلیمی پیاس بجھانے کے لئے اصحاب ثلاثہ پر مشتمل یہ قافلہ شوق ۱۹۴۷ء میں میرٹھ روانہ ہوا۔ اور مشہور دینی درس گاہ مدرسہ اسلامیہ اندر کوٹ میرٹھ میں امام النحو صدر العلما حضرت مولانا غلام جیلانی میرٹھی اور حضرت مولانا مبین الدین امروہوی سے مکمل ایک سال اکتساب فیض کیا۔

ان دنوں دار العلوم اشرفیہ مبارکپور کا تعلیمی شہرہ ملک کے طول و عرض میں پھیل چکا تھا۔ میخانۂ حافظ ملت کی بافیض شراب علم و حکمت کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ علمی و روحانی فیوض و برکات کے جام پر جام چل رہے تھے۔ اس مثالی درس گاہ کی دھوم آپ نے بھی محسوس کی اور دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ پھر چند افراد کا یہ مختصر قافلہ ۱۹۴۸ء میں مبارکپور پہونچ گیا۔ یہاں آپ کے علمی و فکری شوق کو بھرپور تسکین ملی۔ اور حضور حافظ ملت کے زیر سایہ علوم و فنون کے ماہر اساتذہ سے خوب خوب سیرابی حاصل کی، جن میں حضرت علامہ عبد الرؤف بلیاوی، حضرت علامہ عبد المصطفےٰ اعظمی، حضرت مولانا غلام جیلانی اعظمی، اور حضرت مولانا محمد سلیمان بھاگلپوری وغیرہ ہیں ——— آپ پر حضور حافظ ملت کا خصوصی فیضان تھا۔ آپ کو درس کے خارجی اوقات میں بھی پڑھاتے تھے بلکہ سفر تک میں درس دیا کرتے تھے اس طرح کا ایک واقعہ خود موصوف نے سپرد قلم فرمایا ہے ——— جو کئی اعتبار سے طلبہ و اساتذہ کے لئے مفید اور مشعل راہ ہے۔ آپ رقمطراز ہیں۔

"آپ کے ساغر علم و حکمت خواہ سفر ہو یا حضر ہر فرد ملت پر یکساں طور پر چھلک رہے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ بھاؤ پور کے جلسہ میں تشریف لے جانے والے تھے۔ حضرت کی نگاہ انتخاب نے کفش برداری کے لئے عقیدت کیش ہی کو منتخب کیا۔ چونکہ سالانہ امتحان بالکل ہی قریب تھا۔ اس بنا پر حضرت کی طلبہ نواز

طبیعت کتب درسیہ ہمراہ لے چلنے پر مُصر ہوئی جس میں خاص طور سے منطق کی ایک معرکۃ الآرا کتاب "حمد اللہ" جو حضرت کے یہاں ہو رہی تھی، بہر حال سفر کا آغاز مبارکپور سے ہوا۔ بذریعہ ٹرین مئو پہونچے۔ مئو ٹرین پر سوار ہوئے۔ مسافروں کی کثرت سے کہیں جگہ نہ مل سکی۔ بالآخر بنچ کے کنارے بکس رکھ کر اس پر بستر بچھا دیا، اس کے بعد حضرت سے عرض کیا حضور تشریف رکھیں حامل النعل اسی بکس سے متصل نیچے بیٹھ گیا۔ میرے اصرار پر حضرت نے آرام فرمایا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد حضرت کی آنکھ لگ گئی۔ اور میں حمد اللہ کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ دوران مطالعہ میں مغلقات کتاب حل کرتا جاتا۔ مگر صورت حل پر نئے اشکال پیدا ہوتے رہتے۔ اور اپنی کاوش لاحاصل سمجھتا، اس عالم میں غیر ارادی طور پر میری گردن حضرت کی جانب مڑ جاتی، معاً حضرت بیدار ہو جاتے اور اپنی خداداد قوتِ باطنہ سے صورت حال سمجھ جاتے۔ اور فوراً ارشاد ہوتا ـــــ کیوں اشکال پیدا ہو رہا ہے؟ فلاں اشکال کا دفع یہ ہے، اور فلاں اشکال کا حل یہ ہے"۔

حمد اللہ جیسی کتاب پڑھنے پڑھانے والے حضرات بخوبی یہ جانتے ہیں کہ مطالعہ کے وقت ان پر کیا گزرتی ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ عبارات کے نفس مطالب میں اشکال نہ تھا بلکہ مفاہیم عبارات میں میرے اپنے ذہنی اشکال تھے۔ جو خود اپنے ذہن کی پیداوار تھے۔ بلکہ اظہار حقیقت کے پیش نظر نہ کہنا ناشکری ہوگی کہ یہ صلاحیت بھی حضرت کی عنایات کی رہین منت ہے۔ اب ایسی شکل میں ذہن کے کھٹکوں سے واقف ہونا کتنی اہم بات ہے مزید برآں ذہنی اشکال کو دور کرنا یہ فیضان الٰہی نہ تو پھر اور کیا ہے۔ حضرت اپنی کنیت کے مطابق ابو الفیض تھے۔

درس نظامی کی باضابطہ تکمیل دار العلوم اشرفیہ مبارکپور سے ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ فراغت کے بعد مزید تعلیم کیلئے خصوصی طور پر حضور حافظ ملت نے آپ کو روک لیا اس دوران آپ نے منقولات میں بڑی مہارت حاصل کی۔ اور معقولات میں تو پہلے ہی خاصا

عبور حاصل کرلیا تھا۔ ان چند سالوں میں حضور حافظ ملت اور جامعہ اشرفیہ کے در و دیوار کی محبت اتنی رچ بس گئی تھی کہ جدائی کا ایک لمحہ گوارا نہ تھا۔ مگر بہر حال خدمتِ دین، اور اشاعتِ سنیت کے لئے کسی نہ کسی دن آپ کو "مادرِ علمی" چھوڑنا ہی تھا۔

انہیں دنوں مدرسہ ضیاء الاسلام اترولہ گونڈہ کے ارباب حل وعقد نے حضور حافظ ملت سے اپنے مدرسہ کے لئے ایک صدر مدرس کی درخواست کی۔ اس عہدہ کے لئے حضور حافظ ملت نے آپ کو منتخب کیا۔ اور یہ ذمہ داری سنبھالنے کا حکم صادر فرمایا۔ مفارقت کے اس صدمۂ جانکاہ سے دل و دماغ کا عالم زیر و زبر ہوگیا۔ اس وقت حضور حافظ ملت نے فرمایا۔

"تم کو تبلیغ دین وسنیت کے لئے تیار کیا تھا۔ اب دین کو تمہاری تبلیغ کی ضرورت ہے اس لئے جاؤ۔"

یہ فرماکر حضور حافظ ملت نے سینۂ مبارک سے لگایا۔ اور رخصت کیا۔ آپ کے ہم دم وہم درس حضرت مولانا سید حامد اشرف صاحب کچھوچھوی نے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا۔ اور تمام طلبہ نے غم ومسرت کے ملے جلے جذبات سے الوداع کہا۔

مدرسہ ضیاء الاسلام میں دو برس تک تدریسی اور صدارتی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی نبھایا۔ آپ کے حسن تدبر اور محنت ولگن سے مدرسہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس کے بعد مدرسہ انوار العلوم تلسی پور کے ذمہ داروں نے آپکے بارے میں حضور حافظ ملت سے درخواست کی جو حالات کے پیش نظر منظور ہوگئی اور آپ بحکم حافظ ملت ۱۹۵۴ء میں تلسی پور چلے آئے۔ اور مدرسہ انوار العلوم میں چار سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ انہیں دنوں آپ سخت علالت کے سبب خلیل آباد کے ایک اسپتال میں زیر علاج تھے کہ اچانک ایک صاحب حضور حافظ ملت کا حکم نامہ مع زادِ راہ لیکر پہونچے جس میں سلام و دعا کے بعد یہ حکم مرقوم تھا۔

"آپ فوراً دامودر پور چلے جائیں وہاں کے ادارہ کو فروغ دینا ہے اور بڑھتی ہوئی بدمذہبیت کا قلع قمع کرنا ہے۔"

اس حکم کے بعد آپ ۱۹۵۷ء میں محبوب الاولیا، شاہ تیغ علی علیہ الرحمہ کے قائم کردہ مدرسہ انوار العلوم علیمیہ دامودر پور بہار تشریف لے گئے۔ جس وقت یہاں پہونچے مدرسہ ابتدائی مراحل میں تھا۔ چاروں طرف بد مذہبوں اور مخالفوں کا طوفان تھا۔ مگر آپ کی پیہم کوششوں اور جانفشانیوں کا یہ ثمرہ ظاہر ہوا کہ چھوٹی سی درسگاہ صوبۂ بہار کا مرکزی دار العلوم بن گئی۔ ٹھوس علمی لیاقت اور تدریسی صلاحیت کا اس قدر شہرہ ہوا کہ دور دراز سے جوق در جوق طلبہ کے قافلے اترنے لگے اور داخلہ کی گنجائش تک ختم ہو گئی۔ اور ہر ہر سال بیس بیس تیس تیس کی تعداد میں باصلاحیت علماء وحفاظ فارغ ہونے لگے۔ دار العلوم علیمیہ کی ترقیاں اور اس علاقہ میں سنیت کا فروغ وارتقا آپ کی بے پناہ مساعی جمیلہ کی حسین یادگار اور ناقابل شکست نقوش ہیں۔ یہاں آپ نے تقریباً پندرہ برس تک علمی، دینی خدمت انجام دی۔

اس کے بعد آپ دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی کے اراکین کے اصرار اور حضور حافظ ملت کے ایما پر دار العلوم علیمیہ تشریف لے گئے۔ یہاں کوئی ایسا انتظام نہ تھا کہ مدرسہ دار العلوم بن سکے۔ آپ کی کوششوں سے بیرونی طلبہ کے قیام وطعام کا انتظام ہوا اور سررشتۂ تعلیم اتر پردیش سے الحاق کیا گیا۔ اس کے بعد تعلیمی نظم ونسق کافی ترقی کر گیا۔ طلبہ بورڈ کے امتحانات میں شریک ہونے لگے۔ اور جلسۂ دستار فضیلت کا انعقاد بھی ہوا۔ اس دوران حافظ ملت کے وصال جانکاہ کی خبر ملی۔ اس قیامت آشوب حادثہ کا دل ودماغ پر بہت بڑا اثر پڑا۔ اور شدید علالت میں مبتلا ہو کر بیٹھ گئے۔ آخر میں آپ دار العلوم تدریس الاسلام بسڈیلہ بستی میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے اور تادم آخر اسی کی خدمات انجام دیتے رہے۔

آپ نے عہد تدریس میں مختلف درسگاہیں بدلیں۔ مگر اس عہد تدریس کا سرسری جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت ہر موڑ پر جلوہ بار نظر آتی ہے کہ درسگاہوں کے بدلنے کا سبب منصب کی طلب اور دولت کی خواہش نہ تھی بلکہ ہر موقع پر حضور حافظ ملت کا حکم اور علم دین کا فروغ نظر آتا ہے ——— کئی ابتدائی مدرسوں کو شہرستان علم بنا دیا۔ اور کئی مکاتب کو اعلیٰ درسگاہوں میں تبدیل کر دیا۔

یہ صحیح ہے کہ آپ صرف ایک اعلیٰ مدرس تھے۔ مگر حسب موقع ناصحی تقریریں

بھی کیا کرتے تھے۔ مختلف ادوار میں مختلف درسگاہوں میں آپ کے فیض یافتہ تلامذہ کی ایک طویل فہرست ہے جو ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مشاہیر تلامذہ میں چند اسماء یہ ہیں۔

- ○ —— حضرت مولانا محمد اسلم بستوی صاحب شیخ الحدیث انوار القرآن بلرام پور
- ○ —— حضرت مولانا انور علی مصباحی کرناٹک
- ○ —— حضرت مولانا شفیق الرحمٰن صاحب استاذ دار العلوم محمدیہ بمبئی
- ○ —— مولانا شمس الہدیٰ صاحب استاذ جامعہ اشرفیہ مبارکپور
- ○ —— مولانا قمر الحسن صاحب استاذ دار العلوم محبوب سبحانی بمبئی
- ○ —— مولانا مسعود احمد صاحب استاذ دار العلوم اشرفیہ مبارکپور
- ○ —— مولانا عبد الرحمٰن صاحب استاذ جامعہ امجدیہ گھوسی
- ○ —— مولانا محمد یعقوب صاحب استاذ دار العلوم حنفیہ غوثیہ بجر ڈیہہ بنارس

آپ کی نسبی یادگاروں میں تین صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے ہیں۔ جناب عبد العلی عزیزی، جناب عبد القوی عزیزی، اور جناب عبد النبی عزیزی —— ماشاء اللہ تینوں بڑے ملنسار اور خوش اخلاق ہیں، بمبئی میں کاروبار کرتے ہیں، معاشی حالت بھی اچھی ہے —— ۳؍جنوری ۱۹۹۲ء کو بمبئی میں جامعہ اشرفیہ کے ایک دفتر برائے رابطہ عامہ کا افتتاح تھا، جس میں شرکت کے لئے ایک وفد جامعہ اشرفیہ سے گیا تھا اس میں راقم بھی تھا۔ اس موقع پر تینوں صاحبزادوں سے ملاقات ہوئی۔ جناب عبد العلی صاحب نے اپنے والد گرامی مرحوم کے آخری ایام کی روداد بڑے رقت انگیز انداز میں سنائی تھی جو کچھ اس طرح ہے۔

حضرت مولانا کاظم علی علیہ الرحمہ ادھر کچھ دنوں سے علیل چل رہے تھے۔ اپنے چھوٹے صاحبزادے کے ساتھ ۲۳؍نومبر ۱۹۹۱ء کو بستی سے بسلسلۂ علاج بمبئی تشریف لائے تھے یہاں مختلف ڈاکٹروں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ بڑے سے بڑا علاج بھی کیا گیا —— مگر شفا مقدر نہیں تھی نہیں ہوئی۔ بلکہ دن بدن طبیعت بگڑتی گئی۔ ان دنوں ایک خواہش

نے آپ کو بہت تڑپایا کہ مجھے میرے مرشد حضور حافظ ملت کی بارگاہ میں مبارکپور لے چلو۔ اس تمنا کا انہوں نے بار بار اظہار کیا ——— آخر میں آپ نے چند وصیتیں بھی کیں کہ میری کتابوں میں سے بخاری اور بیضاوی دار العلوم محمدیہ کو دینا، اور جلالین، مشکوٰۃ، ترمذی اور مدارک مدرسہ مصباح العلوم میں پہونچا دینا۔ اور میری نماز جنازہ اشرف العلماء حضرت مولانا سید حامد اشرف صاحب کچھوچھوی پڑھائیں۔ شجرہ خوانی اور کلموں کے پڑھنے کا حکم دیا اور خود بھی ورد کرتے رہے۔ ۱۶/ دسمبر ۱۹۹۱ء دوشنبہ وقت شام ۶ بجکر ۵۰ منٹ کا واقعہ ہے کہ اچانک چہرہ پر بشاشت اور پرکشش رونق نمودار ہوئی۔ اور کلمہ طیبہ پڑھتے پڑھتے جان جان آفریں کے حوالے کر دی ——— سچ ہے ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

وصیت کے مطابق نماز جنازہ حضرت اشرف العلماء نے پڑھائی۔ جنازہ میں کثیر تعداد میں علمائے کرام اور ائمہ مساجد نے شرکت کی۔ اور ۱۷/ دسمبر ۱۹۹۱ء تقریباً ۱۱ بجے دن ناریل واڑی قبرستان بمبئی میں بصد حسرت و یاس سپرد خاک کیا گیا۔